بچھڑی ہوئی کونج

اور دوسرے افسانے

منیر الدین احمد

جملہ حقوق محفوظ ہیں

فہرست

نتاشا

مسدود راستہ

بے روزگار

نسبی اولاد

جلاوطنی کی قید

رچرڈ رائٹ

کچا علم

نہلے پر دھلہ

بچھڑی ہوئی کونج

آنے والا ماضی

ولی اللہ

جیون خان

نتاشا

خبر اخبار کے پہلے صفحے پر چھپی تھی اور ماں بیٹی کے بارے میں تھی، جن کی لاشیں تین ماہ تک اپنے مکان میں پڑی رہی تھیں۔ کسی عزیز، دوست یا ہمسائے کو ان کی گمشدگی کا احساس نہ ہوا تھا۔ مجھے یہ پڑھ کر دکھ ضرور ہوا، مگر میں نے شاید اس خبر کو اہمیت نہ دی ہوتی، اگر اس کا تعلق ایلمس ہورن سے نہ ہوتا، جہاں پر ہم نے اپنی زندگی کے چند برس گذارے تھے۔

ایلمس ہورن شمالی جرمنی کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، جسکے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں پوری دنیا سمائی ہوئی ہے۔ اس قصبے کا شمالی سرا نارتھ پول کہلاتا ہے اور جنوبی کونا ساؤتھ پول۔ پھر اسی پر بس نہیں، وہاں پر ایک محلّہ سائبیریا کے نام سے بھی پایا جاتا ہے۔ مگر جب ہم نے وہاں پر مکان خریدنے کا ارادہ کیا، تو ہمیں ان باتوں کا کوئی علم نہ تھا اور نہ ہی ہم جانتے تھے کہ اس قصبے میں رہائش سے ہمارا دل اتنی جلدی اکتا جائے گا۔ ہمیں صرف یہ چیز وہاں پر لائی تھی کہ اس سے اچھا اور سستا مکان ہمیں ہمبرگ کے گرد و نواح میں اور کہیں نہیں مل رہا تھا۔ ہمبرگ میں، جہاں پر ہم کئی برسوں سے مقیم تھے، مکان خریدنے کا ہم اس زمانے میں تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہاں پر مکانوں کی قیمتیں ہماری دسترس سے باہر تھیں۔ اس زمانے میں میری ملازمت نئی نئی تھی اور ہمارے پاس ابھی اتنا سرمایہ نہیں تھا کہ کسی مہنگے مکان کے لئے ڈاؤن پے مینٹ کر سکیں۔ ہم ان دنوں ایک آٹھ منزلہ بلڈنگ کے مختصر سے فلیٹ میں رہ رہے تھے، جو ہم دو جنوں کیلئے کافی تھا۔ وہاں پر ہمیں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ ہمسائے شریف لوگ تھے۔ البتہ ہمارے تعلقات انکے ساتھ اجنبیوں جیسے تھے، جو صبح بخیر اور شام بخیر سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ جب کبھی ہم تعطیلات میں سفر پر جاتے تھے، تو اپنے فلیٹ کی چابی ان کے حوالے کر جاتے تھے، تا کہ وہ ہماری غیر حاضری میں بالکنی پر لگے ہوئے اور ڈرائینگ روم میں رکھے ہوئے پودوں کو پانی دے سکیں۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ کوئی شخص لیٹر بکس میں سے ہر روز آنے والے خطوط نکال لیا کرے۔ کیونکہ ڈاک جمع ہوتی رہے اور لیٹر بکس میں سے باہر جھانکنے لگے، تو چوروں چکاروں کو پتہ چل جاتا ہے کہ اس فلیٹ کا ان دنوں میں کوئی رکھوالا نہیں ہے۔

یوں تو مجھے بھی ایک آٹھ منزلہ بلڈنگ میں رہنا کچھ ایسا اچھا نہ لگتا تھا، جہاں پر انسان کو کسی پنجرے میں بند ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ مگر مجھ سے زیادہ اوتا کا دل وہاں پر تنگ پڑتا تھا۔ اس کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی تھی کہ اپنا مکان اور باغ ہو، جہاں پر وہ باغبانی کر سکے۔ اس چیز کا اظہار اس کی بچپن میں بنائی گئی تصویروں سے ہوتا ہے، جن کو اس نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ قریب قریب سب تصویروں میں ایک چھوٹے سے قطعہ زمین پر ایک مختصر سا مکان بنا ہوا ہے، آگے پیچھے لان اور پھولوں کی کیاریاں اور باغ کے کناروں پر پودے لگے ہوئے۔ ایلمس ہورن میں ہمیں جو مکان ملا، وہ ہو بہو ان تصویروں جیسا تو نہیں تھا، مگر دسترخوان برابر لان، چیری کا ایک درخت اور پھولوں کی چند کیاریاں ضرور موجود تھیں۔

پوری کالونی قطار وار بنے ہوئے مکانوں پر مشتمل تھی۔ ہر قطار میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے دس دس مکان تھے۔ ہمارا مکان سب سے آخر میں تھا۔ اسلئے ہمیں سارے گھروں کے آگے سے گذرنا پڑتا تھا۔ مگر اتفاق ایسا تھا کہ جب ہم مکان کو دیکھنے کیلئے گئے، تو کسی ہمسائے سے مٹھ بھیڑ نہ ہوئی۔ یہانتک کہ مکان خرید لینے کے بعد نقل مکانی والے روز تک ہمیں پتہ نہ تھا کہ ہمارے اوس پڑوس میں کون لوگ رہتے ہیں۔ پھر جب ویک اینڈ پر انکو دیکھنے کا اتفاق ہوا، تو ہمیں یہ دیکھ کر کسی قدر مایوسی ہوئی کہ سارے ہمسائے ادھیڑ عمر کے لوگ تھے اور ہم سے بڑے تھے۔ بچوں کا کہیں پر کوئی نام ونشان تک نہ تھا۔ کیا ہم پنشنروں کی کالونی میں آن نکلے تھے؟ لگتا تھا کہ سب لوگ مزدور پیشہ ہیں، جن میں شاید کوئی پڑھا لکھا آدمی نہیں تھا۔

دوسرے یا تیسرے روز میں شام کو انسٹی ٹیوٹ سے گھر واپس لوٹا، تو اوتا نے میرا استقبال اس خبر کے ساتھ کیا کہ ہماری قطار میں ایک پانچ چھ سالہ بچی رہتی ہے، جس کے ساتھ اوتا کی بات ہوئی تھی۔ سویرے سویرے جب اوتا سودا سلف لانے کے لئے جا رہی تھی، تو اس نے بچی کو ایک گھر کے دروازے پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اوتا نے اسے ہیلو کیا اور اس کا نام جاننا چاہا۔ اس نے اپنا نام نتاشا بتایا اور اوتا سے پوچھا کہ کیا ہم وہاں پر نئے منتقل ہوئے ہیں۔ اس نے ہمیں متعدد بار گذرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے پوچھا: "تمہارے میاں کا نام کیا ہے اور وہ کس ملک کا رہنے والا ہے؟" اوتا نے میرا نام بتایا، تو بچی نے کہا: "بہت پیارا نام ہے"۔ اور پاکستان کے بارے میں اس نے کہا: "میں اس ملک کو ڈھونڈ نکالوں گی"۔ اوتا نے حیرانی کا اظہار کیا اور کہا: "تم تو ابھی اسکول نہیں جاتی ہو گی"۔ نتاشا نے جواب دیا:

"میرے پاس ایک اٹلس ہے، جس میں ساری دنیا کے ملکوں کے نقشے پائے جاتے ہیں اور میں ان پر اپنی انگلی پھیر کر ان کی سیر کیا کرتی ہوں"۔

اگلی بار ہم نے نتاشا کو ایک بوڑھی عورت کے ساتھ بس اسٹینڈ پر دیکھا، جو اس کی دادی یا شاید نانی تھی۔ نتاشا نے آگے بڑھ کر اوتا کو سلام کیا اور کہا:

" کیا تم میرا تعارف منیر سے نہیں کراؤ گی؟ میں نے اٹلس میں پاکستان کو ڈھونڈ لیا ہے۔ وہ ہندوستان کے مغرب کی طرف واقع ہے اور اس کے شمال میں ہمالیہ پہاڑ پایا جاتا ہے ،جس پر سارا سال برف پڑی رہتی ہے۔ پاکستان کے دریا ہمالیہ سے نکلتے ہیں۔ دریائے سندھ سب سے لمبا دریا ہے"۔

"تم تو اچھی خاصی ہوشیار لڑکی ہو۔ کیا تم کو پڑھنا آتا ہے یا کوئی تمہاری مدد کرتا ہے؟" اوتا نے کہا۔

نتاشا نے جواب دیا: "پاکستان کو میں نے اکیلے تلاش کر لیا تھا۔ البتہ میری ماں مجھے پڑھاتی ہے اور میں اتنی اتنی موٹی کتابیں پڑھ لیتی ہوں"۔ یہ کہتے ہوئے اس نے ہاتھ کی انگلیوں کو پھیلا کر ہمیں کتابوں کی موٹائی سے آگاہ کیا۔ پھر اس نے بوڑھی عورت کی طرف اشارہ کر کے کہا: "یہ میری نانی ہے، جو کتابوں کے چناؤ کے سلسلے میں میری مدد کرتی ہے۔ یہی انہیں الماری میں سے نکال کر دیتی ہے"۔

نانی نے معذرت بھری نظروں سے ہماری طرف تکتے ہوئے کہا: "میری دوہتی خواہ مخواہ راستہ چلتے لوگوں سے باتیں کرنے لگتی ہے اور انکو تنگ کرتی ہے۔ آپ کچھ خیال نہ کریں۔ اسکو پڑھنا بس واجبی سا آتا ہے۔ سارا دن ماں کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ کہتی ہے مجھے اسکول میں داخل کرا دو۔ وگرنہ میں گھر سے بھاگ جاؤں گی"

" کیا نتاشا کنڈرگارٹن میں نہیں جاتی؟" اوتا نے پوچھا۔

مگر اس سوال کا جواب ملنے سے پہلے بس آ گئی اور نانی نتاشا سمیت بس کے پچھلے حصے میں کہیں گم ہو گئی۔ ہمیں ڈرائیور کی پشت پر سیٹ ملی۔

اس کے بعد بہت دنوں تک نتاشا ہمیں کہیں پر نظر نہ آئی۔ میں نے انسٹی ٹیوٹ سے چھٹی لے رکھی تھی اور ہم اپنے مکان میں وال پیپر لگا رہے تھے۔ ہمیں اس زمانے میں اس کام کا کچھ ایسا تجربہ نہ تھا۔ اس لئے ہمارے اناڑی پن کے کارن اس پر بہت وقت صرف ہو رہا

تھا۔تعطیلات کا سارا عرصہ وال پیپر لگانے اور کھڑکیوں اور دروازوں پر وارنش کرنے میں لگ گیا اور ہم اس سال سفر پر نہ جا سکے۔ وگرنہ اس زمانے میں ہمارا معمول تھا کہ ہر سال تین چار ہفتوں کے لئے جنوبی یورپ کے کسی ملک کی سیاحت پر نکل جاتے تھے۔

ایک روز نتاشا نے ہمارے مکان کی گھنٹی بجائی۔ اوتا نے دروازہ کھولا، تو نتاشا نے چھوٹتے ہی پوچھا کہ کیا وہ اس کے ساتھ کھیل کے میدان میں جا سکتی ہے۔ پتہ چلا کہ نانی کسی کام میں مصروف تھی اور ماں بیمار تھی۔ نتاشا کو اکیلے وہاں پر جانے کی اجازت نہ تھی۔ اسلئے نانی نے کہا تھا کہ اوتا سے جا کر پوچھو۔ اگر وہ تمہارے ساتھ جانے کیلئے تیار ہو جائے، تو پھر اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میں نے کہا کہ وہ بیشک نتاشا کے ساتھ چلی جائے، میں اکیلا کام سے نپٹ لوں گا۔

اوتا کہیں دو تین گھنٹوں کے بعد واپس لوٹی۔ اس نے کہا: " یہ نتاشا تو ایکدم باؤلی ہے۔ جو کوئی ننھا بچہ اس کے نزدیک پھٹکتا ہے، اس کو پکڑ کر چومنے لگتی ہے۔ چونکہ بچے اس کو نہیں جانتے، اس لئے وہ ڈر کے مارے رونے لگ جاتے ہیں اور یہ پاگل کسی بوڑھی اماں کی طرح ان کو گلے سے لگا کر پچکارتی ہے۔ اس کے سر میں یہ بات نہیں جاتی کہ بچوں کو اس کا پیار کرنا اچھا نہیں لگتا"۔

میں نے کہا: " وہ اپنے گھر میں اکیلی لڑکی جو ہوئی۔ پھر اس کا سارا وقت ماں اور بوڑھی نانی کے ساتھ گذرتا ہے۔ اس لئے ان کی نقل کرتی ہوگی"۔

اوتا نے جواب دیا: " وہ بچوں کو لوریاں سناتی ہے اور یوں دلاسہ دلاتی ہے، جیسے وہ دودھ پیتے ننھے بچے ہوں اور یہ بڑی اماں ان کیلئے سب کچھ کر سکتی ہے۔ ایک بچی جھولے پر سے گر گئی اور اس کو بازو پر تھوڑی سی خراش آئی۔ نتاشا بھاگتی ہوئی وہاں پر پہنچ گئی اور کسی ٹرینڈ نرس کی طرح ماہرانہ انداز میں زخم کا جائزہ لینے کے بعد اس نے کہا: " معمولی خراش آئی ہے۔ گھبراہٹ کی کوئی بات نہیں"۔ پھر اسنے اپنی جیب میں سے پلاسٹر کی اسٹیرپ نکال کر بچی کے بازو پر لگا دی"۔

اوتا کو نتاشا نے راستے میں بتایا کہ اس کی ماں لیڈی ڈاکٹر ہے۔ پہلے وہ مقامی ہسپتال میں کام کرتی تھی، مگر اب بیماری کے سبب کام پر نہیں جاتی۔ اوتا نے پوچھا کہ اسکا باپ کیا کرتا ہے اور کہاں پر ہوتا ہے؟ نتاشا نے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ شاید اسکو اس بارے میں

بتانے سے منع کیا گیا تھا۔عین ممکن تھا کہ نتاشا کی ماں کی طلاق ہوگئی ہو۔ یہ بات اوتا کو بالکل نہ سوجھی کہ نتاشا کنواری ماں کی بیٹی بھی تو ہوسکتی تھی۔البتہ اس زمانے میں کنواری مائیں کم ہی دیکھنے میں آتی تھیں۔اب تو اس کا اس قدر رواج ہوگیا ہے کہ بیشتر بچے شادی کے بغیر پیدا ہوتے ہیں،اور جو محدودے چند لوگ شادیاں کرتے ہیں، وہ اکثر بچوں کی پیدائش کے بعد ہی شادی کا اہتمام کرتے ہیں۔

ہم نے نتاشا کی ماں کو نہیں دیکھا تھا۔ان کے گھر کی کھڑکیاں ہر وقت بند رہتی تھیں۔ مکان کے باغیچے میں گھاس گھٹنوں گھٹنوں اگی ہوئی تھی۔آس پاس کے باغیچوں کے لان صاف ستھرے تھے، جیسے گھاس کے ایک ایک تنکے کو ناخن تراشنے والی قینچی سے کاٹا گیا ہو۔ صرف نتاشا کے گھر کا لان مکمل طور پر خودرو پودوں سے اٹا پڑا تھا۔اوتا کا خیال تھا کہ شاید ان کے پاس گھاس کاٹنے والی مشین نہیں ہے۔اس لئے وہ کسی روز نتاشا کی نانی کو پیش کش کرنا چاہتی تھی کہ اگر وہ پسند کرے،تو ہماری گھاس کاٹنے والی مشین عاریتاً لے سکتی ہے۔مگر میں اس بات کے حق میں نہیں تھا، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ نانی ہماری پیش کش کو اپنے اوپر تنقید سمجھ بیٹھے۔ یوں بھی ان کے لان کی گھاس اتنی اونچی تھی کہ اسکو کاٹنے کیلئے درانتی درکار تھی۔ یہ کام کسی چھوٹی موٹی گھاس کاٹنے والی مشین کے بس کا نہ تھا۔

نتاشا نے اوتا کو بتایا تھا کہ اس کی ماں صرف رات کو اندھیرا پڑنے کے بعد گھر سے باہر نکلتی ہے۔دن کے وقت وہ اپنے کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے اور کرٹن کھینچ کر پڑی رہتی ہے۔کھانا پکانے کا کام نانی کے سپرد ہے اور وہی گھر بار کیلئے مارکیٹ سے خوردو نوش کا سامان لاتی ہے۔نتاشا اس سلسلے میں اسکی مدد کرتی ہے۔وہ باورچی خانے میں بھی نانی کا ہاتھ بٹاتی ہے۔اوتا کو اسکی بات پر اعتبار نہ آیا۔اسکا خیال تھا کہ وہ ہاتھ بٹانے سے زیادہ نانی کے کام میں رکاوٹ ڈالتی ہوگی۔

ہماری قطار کے مکانوں کا باورچی خانہ بہت چھوٹا تھا،جس میں البتہ ایک دیوار کے ساتھ بعض گھروں میں لوگوں نے چھوٹا سا میز لگا رکھا تھا۔وہاں پر وہ لوگ اکثر کھانا کھاتے ہوئے دیکھے جاسکتے تھے۔ہمارا ڈائینگ ٹیبل بڑے کمرے میں دھرا تھا۔البتہ صبح کے وقت کام پر جانے کی جلدی میں ناشتے کا سامان اٹھا کر کمرے میں لے جانے اور پھر کراکری کو واپس باورچی خانے میں پہنچانے کی کوفت سے بچنے کی خاطر میں چاہتا تھا کہ باورچی خانے میں ایک

فولڈنگ ٹیبل لگا لیا جائے اور اس کے ساتھ دو کرسیاں رکھ لی جائیں ۔ جرمنی میں اس زمانے میں ابھی ایسے فولڈنگ ٹیبلوں کا رواج نہ تھا۔ اس لئے مجھے خود ایک ایسا میز ایجاد کرنا پڑا، جس پر مجھے بے حد فخر تھا۔ اس طرح ہم بھی باورچی خانے میں صبح کا ناشتہ کرنے لگے تھے۔

ایک روز نتاشا ہمارے ہاں آئی، تو اوتا نے اسے آئس کریم کی پیش کش کی۔ اوتا نے اپنے اور اس کیلئے دو کپ تیار کئے اور باورچی خانے کے فولڈنگ ٹیبل کو کھول کر اس پر رکھے اور کرسیاں لگا دیں۔ مگر نتاشا نے باورچی خانے میں بیٹھ کر آئس کریم کھانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مہذب لوگ کچن میں نہیں کھایا کرتے۔ اسی پر بس نہیں تھی۔ نتاشا کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے اور ہر قسم کے ادب آداب سے پوری طرح آگاہ تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ نانی نے اپنی جوانی کے زمانے کے جملہ آداب اسکو سکھا دیئے تھے۔ جسکے سبب وہ ہمارے وقتوں کی بچی نہیں لگتی تھی، بلکہ انیسویں صدی کی کھوسٹ بڑھیا، جو کسی طرح زمانے کے گردش سے بچ نکلی تھی۔

نانی کو نتاشا پر بہت فخر تھا۔ وہ اس کی سمجھ بوجھ کی تعریف کرتی تھی۔ اوتا کا خیال تھا کہ نتاشا کو کنڈر گارٹن میں بھیجا جانا چاہیئے، تاکہ وہ دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر کھیلے کودے اور سیکھے کہ آپس کے جھگڑوں کو کیسے نپٹایا جاتا ہے۔ مگر نانی اس طرف بالکل نہیں جاتی تھی۔ اسے نتاشا سے کہیں زیادہ اپنی بیٹی کے مستقبل کی فکر لگی ہوئی تھی۔ چونکہ وہ کھل کر ہمیں اس بارے میں کچھ نہیں بتاتی تھی، اس لئے ہم کوئی مشورہ نہیں دے سکتے تھے۔ البتہ ہم اس بات پر ضرور حیران ہوتے تھے کہ ہمیں وہاں پر رہتے ہوئے ایک سال سے اوپر ہو گیا تھا، جس کے دوران نتاشا باقاعدگی کے ساتھ اور نانی گاہے بگاہے ہمارے ہاں آتی رہتی تھیں، مگر نتاشا کی ماں سے ہمارا ملنا کبھی نہیں ہوا تھا۔ اوتا کو تو یہ شبہ ہو چلا تھا کہ نتاشا کی ماں کا وجود پایا ہی نہیں جاتا اور نانی اور نتاشا ہمیں الو بنا رہی تھیں۔

پھر ایک شام نانی ہمارے گھر پر آئی اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے اوتا سے پوچھا کہ کیا وہ اگلے روز نتاشا کو چند گھنٹوں کیلئے اس کے پاس چھوڑ سکتی ہے۔ اوتا ان دنوں اپنا مقالہ لکھ رہی تھی اور اکثر وقت گھر پر ہی رہتی تھی۔ نانی نے کہا کہ نتاشا کاغذ اور رنگین پنسلیں اپنے ساتھ لائے گی اور سارا وقت تصویریں بناتے ہوئے گذارے گی۔ مجھے یہ خدشہ تھا کہ اوتا کے وقت کا ضیاع ہوگا۔ مگر اوتا نانی کی مدد کرنا چاہتی تھی، اسلئے اس نے نتاشا کو لینے پر

رضا مندی کا اظہار کیا۔

میں شام کو انسٹی ٹیوٹ سے واپس لوٹا، تو نتاشا جا چکی تھی۔ اوتا نے دن بھر کا ماجرا سنایا۔ اسے نتاشا کی زبانی پتہ چلا تھا کہ اس روز کوئی سرکاری کارندہ ان کے گھر آ رہا تھا اور اس کی ماں نہیں چاہتی تھی کہ جب وہ آئے، تو نتاشا گھر پر ہو۔ نتاشا کو پتہ نہیں تھا کہ سرکاری کارندے کو ان کے گھر پر کیا کام تھا۔

یہ راز کچھ دنوں کے بعد نانی نے خود کھول دیا۔ سرکاری کارندہ ان کے گھر پر اس لئے آیا تھا، کیونکہ انہوں نے نتاشا کو اسکول میں داخل نہیں کرایا تھا۔ جرمنی میں لازمی تعلیم کا قانون پایا جاتا ہے، جس کے سبب متعلقہ محکمہ اس بات پر نظر رکھتا ہے کہ سب بچے اسکول جائیں۔ نانی کا خیال تھا کہ نتاشا دوسرے بچوں سے کہیں آگے تھی، اس لئے اگر اس کو اسکول میں داخل ہونا پڑا، تو وہ سارا دن بور ہوتی رہے گی۔ اوتا نے کہا کہ نتاشا کو بہرصورت اسکول جانا چاہیئے اور اگر وہ دوسرے بچوں سے آگے ہے، تو پھر اس کو دوسری یا تیسری جماعت میں داخلہ مل سکتا ہے۔ پتہ چلا کہ نتاشا کی ماں اپنی بیٹی کو خود گھر پر پڑھانا چاہتی تھی اور کسی قیمت پر اس کو اسکول بھیجنے کے لئے تیار نہ تھی۔

کچھ ماہ کے بعد مجھے کسی بیماری کے سلسلے میں ایک مقامی ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا۔ اس نے کارڈ پر میرا ایڈریس دیکھ کر پوچھا کہ کیا ہمارا مکان اسی قطار میں ہے، جس میں نتاشا رہتی ہے؟ باتوں باتوں میں یہ ذکر بھی آ گیا کہ ہمیں وہاں پر رہتے ہوئے دو سال ہو چلے تھے، مگر میں نے نتاشا کی ماں کو کبھی نہیں دیکھا تھا اور یہ کہ ان کے مکان کی کھڑکیاں سارا وقت بند رہتی ہیں۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ نتاشا کی ماں کو سورج کی روشنی کی الرجی ہے، جس کے نتیجے میں مریض کی جلد پر پھنسیاں نکل آتی ہیں، جو بے حد تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ اس لئے روشنی سے بچنے کی خاطر وہ دن کے وقت گھر سے باہر نہیں نکلتی۔

"کیا وہ آپ کی مریضہ ہے؟ میں نے پوچھا۔

"ہاں یہ کہہ سکتے ہیں۔ اگرچہ اس نے مجھ سے علاج کرانا چھوڑ دیا ہے"۔ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

چند روز کے بعد میں نے نتاشا کی نانی کے سامنے ذکر کیا کہ میں ڈاکٹر موللر کے پاس گیا تھا۔ تو اس نے کہا کہ میں کیوں اس نیم حکیم کے پاس جاتا ہوں۔ اس کے علاج نے اس کی

بیٹی کی زندگی کو اجیرن بنا دیا تھا۔اس نے اسے بڑی مقدار میں پنسلین دی تھی ،جس نے جلد پر ری ایکشن دکھایا تھا اوراب سورج کی روشنی کی الرجی کی صورت اختیار کر چکا تھا۔

"میں نے سنا ہے کہ آپ کی بیٹی خود بھی میڈیکل ڈاکٹر ہے۔کیا اس کو پتہ نہیں تھا کہ اس کی جلد پنسلین کے خلاف ری ایکشن دکھائے گی؟" میں نے پوچھا۔

"اس بات کا کسی کو پتہ نہیں تھا۔بعض اوقات ڈاکٹر لوگ بھی مار کھا جاتے ہیں"۔نانی نے جواب دیا۔

"کیا اس الرجی کا کوئی علاج نہیں ہوسکتا؟"میں نے جاننا چاہا۔

"میری بیٹی کا کہنا ہے کہ میڈیسن کے پاس اس کا فی الحال کوئی مداوا نہیں ہے"۔نانی کی آنکھوں میں مایوسی کے آنسو تھے۔"میری بیٹی نے ڈاکٹر مولر پر مقدمہ کر رکھا ہے۔وہ اس سے حرجانہ وصول کرنا چاہتی ہے۔ہمارا قیاس ہے کہ ڈاکٹر مولر نے یہ کام میری بیٹی کے سابقہ خاوند کے اشارے پر کیا تھا، جو اس سے بدلہ لینا چاہتا تھا، کیونکہ میری بیٹی نے اس سے اس کی مرضی کے خلاف طلاق لے لی تھی۔وہ پوری پوری کوشش کر رہا ہے کہ اس کو نتاشا کی تربیت کا حق مل جائے۔اس نے عدالت میں درخواست دے رکھی ہے کہ میری بیٹی اپنی بیماری کے سبب اس قابل نہیں ہے کہ نتاشا کی پرورش کا حق ادا کر سکے۔اب اس نے محکمہ تعلیم کو ہمارے پیچھے لگا دیا ہے۔وہ چاہتے ہیں کہ نتاشا کو اسکول میں داخل کرایا جائے اور اگر ایسا نہ کیا گیا ،تو متعلقہ محکمہ نتاشا کو ہم سے چھین لے گا اور یتیم خانے میں داخل کرا دے گا۔یہ ساری کارستانی میرے سابقہ داماد کی ہے"۔

نانی کی گھبراہٹ بے جا نہ تھی۔ایک طرف حکومت کا محکمہ دھمکا رہا تھا اور دوسری طرف نتاشا کی ماں اپنی ہٹ دھرمی پر اتری ہوئی تھی۔پتہ چلا کہ یہ قصہ بہت دنوں سے چل رہا تھا۔ نتاشا کی ماں اپنی بیماری کے کارن گھر میں محبوس تھی ،مگر اس وجہ سے شکست ماننے کے لئے تیار نہ تھی۔نانی چاہتی تھی کہ ہم کسی طرح اس معاملے میں ان کی مدد کریں۔مگر ہمیں صاف نظر آ رہا تھا کہ یہ چیز ہمارے بس سے باہر تھی۔

یوں بھی ہمارا دل اس دوران میں ایلمس ہورن سے بھر گیا تھا۔ریل گاڑی میں ہمبرگ آنے جانے پر روزانہ کم وبیش تین گھنٹے لگ جاتے تھے اور اگر کبھی شام کو تھیٹر میں جانا ہوتا تھا یا کسی دوسری محفل میں شرکت کا پروگرام بن جاتا تھا،تو واپسی کے راستے پر بہت وقت

لگتا تھا اور ہم اکثر آدھی رات کے بعد کہیں گھر پہنچتے تھے۔ اس وجہ سے ہم نے ہمبرگ کے قریب کسی گاؤں میں مکان خریدنے کا ارادہ باندھ لیا تھا، مگر مناسب مکان کی تلاش آسان نہ تھی۔ سترہ مکانوں کو دیکھنے کے بعد ہم نے اپنے موجودہ مکان کے حق میں فیصلہ دیا، جو ہمیں خلاف توقع فوری طور پر مل سکتا تھا۔ پھر ہمارا ایلمس ہورن والا مکان ہفتہ عشرہ کے اندر بک گیا اور ہم نے جھٹ پٹ نقل مکانی کا پروگرام بنالیا۔

اس بات کا علم نتاشا کی نانی کو اس وقت ہوا، جب مزدور ہمارا سامان ٹرک میں لاد رہے تھے۔ وہ ہمیں خاص طور پر یہ بتانے کے لئے آئی کہ اسے، نتاشا کو اور اس کی بیٹی کو ہماری وہاں سے نقل مکانی کا بہت افسوس تھا۔ کیونکہ ہمارے سوا ان کا اس پوری کالونی میں کوئی دوست نہیں تھا۔ ہمسائے ان کے ساتھ بات تک نہیں کرتے تھے۔ ان کو یہ بات پسند نہ آتی تھی کہ ان کے لان کی گھاس نہیں کاٹی جاتی تھی اور ان کی کھڑکیاں سارا دن بند رہتی تھیں۔ کسی نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہ کی تھی کہ اس چیز کا سبب کیا تھا۔ پھر ہمارے سوا کسی نے کبھی نتاشا کو اہمیت نہ دی تھی۔

ہماری نقل مکانی کے چند روز بعد بلدیہ کے متعلقہ محکمہ نے نتاشا کو عدالت کے فیصلہ کے مطابق اپنی تحویل میں لے کر ایک یتیم خانے میں داخل کرادیا۔ ماں اور نانی کو نتاشا سے ملنے کی اجازت تھی، مگر ان کو اس کے بارے میں کوئی اقدام اٹھانے اور فیصلہ کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اس بارے میں نانی نے ہمیں ٹیلی فون پر بتایا اور کہا کہ اس کی بیٹی اتنی آسانی سے شکست قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ وہ عدالت کے فیصلے کے خلاف اپیل کر رہی ہے اور اگر ضروری ہوا، تو وہ ملک کی سب سے اونچی عدالت تک کیس کو لے جائے گی۔

اس کے بعد ہمارا ان کے ساتھ رابطہ ٹوٹ گیا اور ہم اپنی زندگی کے دھندوں میں مصروف ہو کر اس سارے قضیئے کو بھول گئے۔ سالہا سال کے بعد اخبار میں ماں اور بیٹی کی خودکشی کی خبر نظر سے گذری، جن کی لاشیں تین ماہ تک مکان میں پڑی رہی تھیں، بغیر اس کے کہ کسی عزیز، دوست یا ہمسائے کو ان کی گمشدگی کا احساس ہوتا۔ فوراً میرا دھیان نتاشا کی ماں اور نانی کی طرف گیا۔ اس امر کی تصدیق اخبار کے مقامی رپورٹر کی کہانی سے ہوگئی، جسے اس نے ہمسایوں کی زبانی لکھا تھا، مگر جس میں نتاشا کا کوئی ذکر نہ تھا۔

(کمر فیلڈ۔ یکم اگست ۲۰۰۱ء)

مسدود راستہ

میں ناشتہ کرنے کے لئے ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں پہنچا، تو اوتا کے ساتھ ہماری دونوں شریک میز جرمن خواتین میشل اور کونسٹانزے اپنی اپنی سیٹوں پر براجمان ہو چکی تھیں۔ اوتا نے استفہامی نظر سے میری طرف دیکھا، جیسے پوچھ رہی ہو: " کیا کوئی خاص بات تھی؟"

" سات عادی قسم کے فون تھے "۔ میں نے کہا: " البتہ آٹھواں فون عائشہ کا تھا۔ تم جانتی ہو کہ وہ سامنے ہو تو بات دوسری ہے اور میں اٹکل سے کام چلا لیتا ہوں۔ مگر فون پر اس کی کاوڈرویلش کو میں بالکل نہیں سمجھتا۔ اتنے برسوں تک جرمنی میں رہنے کے باوجود جرمن اب تک اس کی زبان پر نہیں چڑھتی اور اس کی افریقن انگریزی اور سوڈانی عربی میرے پلے نہیں پڑتیں۔ جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں وہ کسی ایمرجنسی کی بات کر رہی تھی، جس کا اسے سامنا تھا۔ اسے شاید ہماری مدد کی ضرورت تھی۔ میں نے فوراً اس کے گھر پر فون کیا، مگر ٹیلی فون ایکسچینج کی طرف سے ریکارڈ شدہ جواب ملا: "اس نمبر کے تحت کوئی کنکشن نہیں ہے"۔ ہمارے سفر پر جانے والے روز تک تو وہی نمبر تھا۔ تم نے چلنے سے پہلے خود عائشہ سے بات کی تھی اور اسے بتایا تھا کہ ہم چار ہفتوں کے لئے ملک سے باہر جا رہے ہیں۔ ہوسکتا کہ اس نے اس دوران میں رہائش گاہ بدل لی ہو۔ عائشہ سے ہر بات کی توقع رکھی جاسکتی ہے"۔

" تم کو عائشہ سے خدا واسطے کی چڑ ہے"۔ اوتا نے جھنجھلا کر کہا: " کبھی اسکی زبان پر اعتراض کرتے ہو، کبھی اس کے کپڑوں پر۔ اسکا موٹاپا تم کو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ پتہ نہیں اس بچاری سے کیا قصور سرزد ہو گیا ہے، جو تم یوں ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑے رہتے ہو۔ وہ کرموں کی ماری بہت دکھی عورت ہے۔ خدا جانے اب اسے کس مشکل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے"

یہ ہمارے آرمینیا کے سفر کے دنوں کی بات ہے۔ ہم ہفتے میں ایک دو بار جرمنی میں اپنے گھر پر فون کر کے ریکارڈ شدہ پیغامات سن لیتے تھے۔ ایمرجنسی کی صورت میں کسی ہمسائے کو فون کر کے ضروری ایکشن لیا جاسکتا تھا۔ مگر عائشہ کے سلسلے میں مجھے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ ہمارے واقف کاروں میں سے کوئی اسے نہیں جانتا تھا، اس لئے کسی کو اس سے

رابطہ کرنے کے لئے نہیں کہا جا سکتا تھا۔

میشل اور کونسٹانزے کی سوالیہ نگاہوں سے اوتا جان چکی تھی کہ اسے عائشہ کا تعارف کرانا پڑے گا۔ تہذیب کے مارے جرمن ایسے معاملات کے بارے میں براہ راست کچھ نہیں پوچھتے، مگر جو کوئی ان کی نظروں کو پڑھ سکتا ہے، اسے پتہ ہے کہ مزید جاننے کے شوق میں ان کے منہ سے رال ٹپکنے کو ہے۔

عائشہ سوڈان کی رہنے والی ہے۔ جرمنی میں اس نے اسایلم کی درخواست دے رکھی ہے۔ اسکا تعلق ایک ماڈرن اسلامی فرقہ سے ہے، جسکو اس ملک کی حکومت نے اسلام سے خارج قرار دے کر اسکے پیروکاروں کے سیاسی وتمدنی حقوق محدود کر دیئے ہیں۔ اس وجہ سے اس جماعت کے ارکان کیلئے دو ہی راستے کھلے ہیں: مذہب بدلنا یا ملک کو چھوڑ جانا۔ بہتوں نے مجبوری کے تحت اپنا مذہب تبدیل کر لیا تھا۔ مگر عائشہ نے ہجرت کرنے کو ترجیح دی تھی۔

"عائشہ ہماری نوکرانی ہے۔" اوتا ہماری ہم میز عورتوں کو بتا رہی تھی، "جو خود اپنا راستہ روکے کھڑی ہے۔ اسے قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مگر اس کا مذہبی جنون کم ہونے کی بجائے بڑھتا جا رہا ہے"۔

ایک عرصہ سے جرمنی میں گھر بار کیلئے ملازم ملنا بہت دشوار ہو گیا ہے۔ ایک زمانے میں جرمن عورتیں دو چار گھنٹوں کیلئے پرائیویٹ گھروں کی صفائی ستھرائی کا کام کرنے کیلئے تیار ہو جاتی تھیں اور اکثر ایسی ملازمت کو دوسرے کاموں پر ترجیح دیتی تھیں، کیونکہ لکھت پڑھت نہ ہونے کے سبب انکم ٹیکس نہیں دینا پڑتا تھا اور انکی ذاتی آزادی بھی برقرار رہتی تھی۔ پھر پرائیویٹ ملازمت کو کسی وقت بھی چھوڑا جا سکتا تھا۔ کسی ادارے یا دوکان کی باضابطہ نوکری کرنے میں بہت سی مشکلات تھیں۔ اہم ترین بات یہ تھی کہ سرکاری قوانین کی پابندی کرنی پڑتی تھی اور انکم ٹیکس اور ہیلتھ انشورنس کی کٹوتی کے سبب نقد تنخواہ گھٹ کر جیب خرچ کے برابر رہ جاتی تھی۔ مگر جب سے ملازمت کے قوانین میں یہ تبدیلی لائی گئی تھی کہ ایک مقررہ رقم تک ملنے والی تنخواہ پر کوئی کٹوتی نہیں کی جائیگی، اس وقت سے پرائیویٹ گھروں کیلئے جرمن ملازمہ حاصل کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ اب گھریلو کاموں کیلئے صرف غیر ملکی عورتیں ملتی ہیں، جنہوں نے اسایلم کی درخواست دے رکھی ہوتی ہے یا جو غیر قانونی طور پر جرمنی میں مقیم ہوتی ہیں اور جنکو سرکاری طور پر ملازمت کرنیکی اجازت نہیں ہوتی۔

اخبار میں ہمارا اشتہار چھپنے پر تین عورتوں کے فون آئے ۔ پہلی پولینڈ کی رہنے والی تھی اور تین ماہ کے ویزے پر آئی تھی ، جس کی معیاد ختم ہو چکی تھی ۔ وہ اپنے کسی یار کے ہاں پولیس سے چھپ چھپا کر رہ رہی تھی ۔ اوتا نے یہ بات سنتے ہی اسے لینے سے انکار کر دیا ۔ کیونکہ وہ قانون شکنی میں مدد دینے کے لئے تیار نہ تھی ۔

دوسری عورت رومانیہ سے تھی ، کسی کارخانے میں ملازمت کر رہی تھی اور صرف ویک اینڈ پر کام کرنے میں دلچسپی رکھتی تھی ۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خاصی تیز طرار عورت تھی ۔ اوتا کو خطرہ تھا کہ اس کے تعلقات اپنے ہموطن جیسیوں کے ساتھ ہو سکتے ہیں ، جو عام طور سے گھروں میں چوریوں میں ملوث پائے جاتے ہیں ۔ بہت سی ایسی وارداتیں ہو چکی ہیں ، جن میں گھروں میں ملازمت کرنے والی ہموطن عورتوں کے ذریعہ ان کو خبریں ملتی تھیں کہ کن دنوں میں مالکان مکان سفر پر جا رہے ہیں اور ان کے گھروں میں کون کون سی قیمتی اشیاء پائی جاتی ہیں ۔ بعض صورتوں میں ملازم عورتوں کی وساطت سے چوروں کو گھروں کی چابیاں بھی مل جاتی ہیں ، جس کے سبب واردات کرنے میں مزید آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں ۔ انہی دنوں میں ایک دلچسپ واقعہ ہوا تھا ، جس کا اخباروں میں چرچا ہوتا رہا ۔ ایک گھر سے مالکان کی غیر حاضری میں چور قیمتی قالین اٹھا کر لے جا رہے تھے ۔ ہمسائے کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ وہ ایک قالین دھونے والی فرم کے ملازم ہیں اور اس کے ہمسائے کے قالین دھونے کے لئے لے جا رہے ہیں ۔ ہمسائے نے کہا کہ یہ تو بہت اچھا موقعہ ہے ، وہ بھی عرصہ سے اپنا قالین دھونے کیلئے بھیجنا چاہتا ہے ۔ چنانچہ اس نے اپنا قیمتی قالین بھی ان کے حوالے کر دیا ۔ واضح ہے کہ ان واقعات کے پیش نظر ہم رومانیہ کی عورت کو ملازم رکھنے کیلئے تیار نہ تھے ۔

تیسرا فون عائشہ کا تھا ، جس کی بات فون پر ہماری سمجھ میں بالکل نہ آتی تھی ۔ البتہ یہ پتہ چل گیا تھا کہ وہ سوڈانی ہے اور تھوڑے عرصہ سے جرمنی میں تھی ۔ ہم نے تجویز پیش کی کہ وہ اتوار کے روز ہمارے ہاں آئے تا کہ اطمینان سے بیٹھ کر بات کی جا سکے ۔ وہ ہم سے قریبی شہر ہمبرگ کے ایک دور دراز علاقے میں رہتی تھی ۔ میں نے کہا کہ اسے پہلے انڈر گراونڈ ریل میں ، پھر سٹی ٹرین سے ہمارے گاؤں تک پہنچنے میں کم سے کم دو گھنٹے لگ جائیں گے ۔ اس نے جواب دیا کہ اگر اسے ملازمت مل سکے ، تو اسے اس بات کی پرواہ نہ ہوگی ۔ اوتا نے پیش کش کی کہ ہم اسے ملازم رکھنے یا نہ رکھنے کا فیصلہ کرنے والی دونوں صورتوں میں آنے جانے اور انٹرویو پر لگنے

والے وقت کا معاوضہ ادا کر دیں گے ۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئی اور اس نے اتوار کے روز نو بجے تک پہنچ جانے کا وعدہ کیا۔

میں اسے لینے کیلئے پنے برگ ریلوے اسٹیشن پر گیا، جہاں پر عائشہ کو ریل گاڑی سے پہنچنا تھا۔ وہاں سے آگے ہمارے گاؤں کیلئے بس لینی پڑتی ہے ۔مگر اتوار کے روز بس صبح کے وقت نہیں چلتی ۔ عائشہ کو پہچاننا کچھ ایسا مشکل نہ تھا ۔ وہ اس صبح سٹی ٹرین سے اترنے والی واحد افریقن عورت تھی ۔ دور سے اسکے ڈیل ڈول کو دیکھ کر میں نے دل میں سوچا کہ اس سے پھرتی سے کام کرنے کی توقع نہیں رکھی جا سکتی ۔ اس کی چال سے مجھے شبہ ہوا کہ کہیں وہ حاملہ نہ ہو، کیونکہ وہ پاؤں گھسیٹ رہی تھی ۔ میں اس کی عمر کے بارے میں بھی تذبذب میں تھا ۔ چہرے مہرے سے وہ بیس پچیس کی لگتی تھی ،مگر اپنے سوڈانی کپڑوں میں ،جن پر کم وبیش ایک پورا تھان لگتا ہے، وہ بڑی عمر کی دکھائی دیتی تھی ۔ البتہ جب قریب پہنچ کر اس نے اپنے سچے موتیوں جیسے سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے مجھے سلام کیا، تو اس کے چہرے پر کنواریوں والی دلفریبی کی جھلک نظر آئی ۔ میں نے اسے خوش آمدید کہا اور بتایا کہ گھر پر ناشتہ ہماری راہ تک رہا ہے ۔ اس نے کہا کہ وہ وقت پر پہنچنے کے لئے اس صبح گھر سے بھوکی نکل کھڑی ہوئی تھی ۔

راستے میں ہمارے درمیان کوئی خاص بات نہیں ہوئی ۔ یوں بھی انٹرویو دراصل اوتا نے لینا تھا اور اسی کو کام دینے یا نہ دینے کا فیصلہ کرنا تھا ۔ میں عام طور سے ایسی گھریلو باتوں میں دخل اندازی سے باز رہتا ہوں ۔ البتہ میں نے جاننا چاہا کہ اس کو ہمبرگ میں کہاں پر ٹھہرایا گیا تھا اور کیا وہ جگہ تسلی بخش تھی ۔ اسایلم کے لئے درخواست دینے والوں کا رہائش کا اپنا انتظام ہو، تو حکومت کی طرف سے اس کا کرایہ ادا کیا جاتا ہے ، وگرنہ ان کو رہائش گاہ مہیا کی جاتی ہے ۔ اس کے علاوہ ان کو سوشل ڈپارٹمنٹ کی طرف سے باقاعدہ ماہوار الاؤنس ملتا ہے ۔ عائشہ نے کہا کہ اس کا ذاتی خرچ حکومت کی طرف سے ملنے والی رقم سے چل جاتا ہے، مگر پیچھے سوڈان میں اس کے بوڑھے ماں باپ ہیں ،جن کی اسے مالی امداد کرنی ہوتی ہے ۔ اس لئے اس نے سوچا تھا کہ اسے کہیں پر کوئی چھوٹی موٹی ملازمت مل جائے ،تو وہ کچھ رقم ماہوار ماں باپ کو بھیج دیا کرے ۔ مگر جرمن زبان نہ جاننے کے سبب اس کو کام نہیں مل رہا تھا ۔ اسے امید تھی کہ ہم اسے ناامید نہیں کریں گے ۔

عائشہ کو جرمنی میں آئے ہوئے تین ماہ ہو چلے تھے ۔ اسکا اسایلم کا کیس اس وقت تک

ابتدائی مراحل میں تھا۔ تاہم اس کے وکیل کو یقین تھا کہ اسے اسایلم مل جائے گی۔ کیونکہ سوڈان کی حکومت نے سیاسی وجوہات کی بنا پر "الاخوان الجمہوریون " کو اسلام سے خارج اور غیر قانونی قرار دے دیا تھا اور اس کے بانی استاذ محمود محمد طٰہٰ کو ارتداد کے جرم کی پاداش میں سزائے موت سنا کر پھانسی پر لٹکا دیا تھا۔ سوڈان کے صدر جعفر النمیر ی نے اپنی حکومت کو بچانے کیلئے، جو ملک میں غیر مقبول ہو چکی تھی، یہ اقدام کیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ حیلہ کارگر ثابت نہ ہوا اور بہت جلد فوج نے اسکی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔

عائشہ کی باتیں سن کر اوتا کو اس پر بے حد ترس آیا اور اس نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ عائشہ کو یورپین گھروں کی صفائی ستھرائی کا کوئی تجربہ نہیں تھا، اس کو ملازم رکھ لیا۔ میں اس بات پر حیران ضرور ہوا، مگر میں نے کچھ نہ کہا۔ آخر بات ان دونوں کے درمیان ہو رہی تھی اور انہیں ہی ایک دوسرے سے معاملہ طے کرنا تھا۔ یوں بھی صفائی والے روز مجھے گھر نکالا مل جاتا تھا۔ کیونکہ میرا وجود کسی بھاری بھرکم صوفے کی طرح صفائی کرنے والی کے راستے میں رکاوٹ گردانا جاتا تھا۔

ملازمت کے سلسلے میں عائشہ بہت سنجیدہ تھی اور کبھی ناغہ نہ کرتی تھی۔ البتہ اس کا کام کرنے کا طریق کار بہت منفرد تھا۔ اس کی ابتداء ریڈیو پر موسیقی کا پروگرام لگانے سے ہوتی تھی ، جس کو سنتے ہی اس کے جسم کا انگ انگ تھرکنے لگتا تھا۔ افریقیوں کو ڈانس کرنے کی مہارت قدرت نے خاص طور پر ودیت کر رکھی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے افریقی بچے کو ڈانس کرتے ہوئے دیکھو، تو لگتا ہے، جیسے ماں نے اس کو دودھ پلانے کے ساتھ ساتھ ناچنے کا ڈھنگ بھی سکھا دیا ہو۔ موسیقی کی تال پر عائشہ کے قدم اس قدر ہلکے پھلکے ہو جاتے تھے، جیسے ان پر کوئی بوجھ نہ ہو۔ وہ سارا وقت گھر بار میں تھرکتی پھرتی تھی اور بعض اوقات ترنگ میں آ کر سوڈانی گیت گانے لگتی تھی۔ اس کی آواز میں خاص لوچ تھا، جو ہمیں بہت اچھا لگتا تھا۔

چونکہ عائشہ کو لمبا سفر کر کے آنا پڑتا تھا، اس لئے اس کی آمد والے روز اس کا صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ ہوتا تھا۔ اس کو بلدیہ کی طرف سے ایک ہوسٹل نما پرانے دو منزلہ مکان میں کمرہ ملا ہوا تھا۔ جہاں پر مختلف ملکوں کے پندرہ بیس افراد مقیم تھے، جو اپنے وطن کو بیروزگاری کے سبب یا کسی دوسری وجہ سے چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے۔ عام طور سے سب لوگ مل جل کر رہتے تھے، مگر دو عرب فیملیوں کے مابین اندرونی طور پر چپقلش پائی جاتی تھی۔ ان میں

سے ایک خاندان فلسطین سے تھا اور جرمنی آنے سے پہلے لمبے عرصے تک بیروت میں پناہ گزین رہ چکا تھا۔ دوسری فیملی لبنانی عیسائیوں کی تھی۔ جس کو اپنا وطن خانہ جنگی کے سبب چھوڑنا پڑا تھا۔ عائشہ کے تعلقات دونوں فیملیوں کے ساتھ دوستانہ تھے۔ عربی زبان ان کے درمیان قدر مشترک تھی۔ مگر دوسری طرف وہاں پر گھانا اور سیرالیون کے افریقن بھی مقیم تھے، جن کے بارے میں عائشہ کو شبہ تھا کہ وہ لوگ ہیروئین کا کاروبار کرتے تھے۔ ان لوگوں کی وجہ سے دوبار مکان کی تلاشی لی جا چکی تھی۔ عائشہ جلد از جلد وہاں سے نقل مکانی کرنا چاہتی تھی، کیونکہ کچھ نوجوان افریقن لڑکے اس کا پیچھا کرنے لگے تھے۔ عائشہ کو خطرہ تھا کہ کسی روز اس پر مجرمانہ حملہ ہوسکتا ہے۔ ڈر کے مارے وہ ہر وقت اپنا کمرہ مقفل رکھتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ایسے خوف و ہراس کا سامنا اس کو اس سے قبل اپنے وطن میں کبھی نہیں کرنا پڑا تھا۔

پھر ایک روز وہی ہوا، جسکا عائشہ کو شروع سے خدشہ تھا۔ ایک رات جبکہ وہ سو رہی تھی، کسی نے ماسٹر چابی سے اسکے کمرے کا دروازہ کھولا اور عائشہ کے بیدار ہونے سے پہلے اس کو اپنے قابو میں کرلیا۔ اسکے منہ اور آنکھوں پر ٹیپ لگا دی گئی۔ اس طرح عائشہ کو بے بس کرنے کے بعد حملہ آور نے اس کی آبروریزی شروع کی، جس کا سلسلہ ساری رات چلتا رہا۔ ساتھ کے کمروں میں سوئے ہوئے دوسرے مکینوں کو خبر تک نہ ہوئی کہ عائشہ پر کیا قیامت گزر رہی تھی۔ کہیں صبح دم ظالم نے اس کا پیچھا چھوڑا اور جاتے ہوئے دھمکی دے کر گیا کہ اگر پولیس کو اطلاع دی، تو جان سے مار ڈالوں گا۔

اگلے روز عائشہ کو ہمارے ہاں آنا تھا۔ مگر دوپہر تک نہ آئی اور اسکی طرف سے کوئی خبر بھی ملی۔ اوتا نے خود فون کیا۔ پتہ چلا کہ کوئی سنگین بات پیش آ گئی تھی۔ اوتا نے کھل کر بتانے کو کہا، تو عائشہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اب واضح تھا کہ ہمیں خود اسکی رہائش گاہ پر جانا تھا۔ اوتا نے کہا کہ وہ گھر پر رہے، ہم اسکی طرف آ رہے ہیں۔

ہمارے آجانے سے عائشہ کی ہمت بڑھی اور اس نے سارا ماجرا بیان کیا۔ مگر وہ کیس کو پولیس کے پاس لے جانے کیلئے تیار نہ تھی۔ اسکو خطرہ تھا کہ مجرم اس کو سچ مچ جان سے مار ڈالے گا۔ کیونکہ اسکے پاس ماسٹر چابی موجود تھی۔ اوتا نے کہا کہ اس چیز کا حل موجود ہے۔ ہم اسکے کمرے کا تالا بدلوا دیتے ہیں، جسکا انتظام میں نے اسی وقت کر دیا۔ ہم نے اصرار کیا کہ اسے بہرصورت پولیس کے پاس جانا چاہیئے، وگرنہ مجرم کو مزید شہہ ملے گی۔ باتوں باتوں میں پتہ چلا

کہ اسے گھانا کے ایک نوجوان پر شبہ تھا، جسکی اس نے ارتکاب جرم کے وقت شکل تو نہیں دیکھی تھی ،مگر جب اس نے اسے دھمکی دی تھی کہ کیس کو پولیس کے پاس نہ لیکر جائے ،تو اس نے اسکی آواز کو پہچان لیا تھا۔

" پھر ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیئے ۔ ہم تمہارے ساتھ پولیس کے پاس چلتے ہیں اور اگر تم چاہو، تو کسی وکیل کو بلا لیتے ہیں "۔ اوتا اس بارے میں پوری طرح سنجیدہ تھی ۔

" لیکن اگر مجھے اس جرم کے نتیجے میں حمل ہو گیا ہے، تو کیا میں اپنے بچے کے باپ کو عدلیہ کے سپرد کرنے کی ذمہ دار نہ ٹھہروں گی ؟" عائشہ کو شاید یہ امید تھی کہ وہ شخص اس سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو جائے گا۔

" ایسے باپ پر لعنت بھیجو" اوتا نے جواب دیا۔ " آج تم اس کے ہتھے چڑھی ہو اور کل کو کوئی دوسری بے گناہ عورت اس کی ہوس کا شکار بن سکتی ہے "۔

پولیس نے کیس درج کر لیا اور اس مکان میں رہنے والے سب مرد باسیوں کو تحقیق کی خاطر چوکی پر حاضر ہونے کا حکم دیا۔ البتہ مجھے یہ احساس تھا کہ وہ اس معاملے کو کچھ اہمیت نہ دے رہے تھے ۔ ایک سپاہی نے عائشہ کی پیٹھ پیچھے یہاں تک کہا کہ یہ افریقی سیکس کے معاملے میں سب ایک دوسرے کے ساتھ ملوث ہوتے ہیں اور ہوسکتا ہے کہ عائشہ نے خود ہی مجرم کو شہہ دی ہو۔

آخر کار وہی ہوا، جس کا ہمیں خدشہ تھا ۔ پولیس نے کئی ہفتوں تک کیس کو طول دینے کے بعد یہ کہہ کر داخل دفتر کر دیا کہ مجرم کا سراغ نہ لگایا جا سکا تھا۔

دوسری طرف عائشہ نے اوتا کو بتایا کہ وہ حمل سے ہے اور کسی قیمت پر وضع حمل کے لئے تیار نہیں ۔ اس نے کہا کہ اس چیز سے اس کا مذہب اس کو روکتا ہے ۔ یوں بھی ہونے والے بچے کا اس معاملے میں کوئی قصور نہیں ۔

ہمیں اس بارے میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔ البتہ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ عائشہ کی مشکلات میں اضافہ ہونے والا تھا۔ وہ دو چار ماہ تک مزید کام کر سکے گی ۔ اس کے بعد اس کا سارا وقت دوسری بے نکاحی ماؤں کی طرح اپنے نوزائدہ بچے کی پرورش و پرداخت پر لگے گا۔ ہماری نظر میں عائشہ یوں بھی بیوقوفوں کی جنت میں رہتی تھی ۔ اس کے ہونے والے بچے کے باپ نے اس سے شادی کرنے کی خواہش کا اظہار نہ کیا تھا ۔ اس کے باوجود عائشہ آس

لگائے بیٹھی تھی۔

ہمارے آرمینیا کے سفر پر جانے سے چنداں پہلے عائشہ کا بیٹا پیدا ہوا تھا، جسکا نام اس نے ہاشم رکھا تھا۔ اوتا نے اسکے بیٹے کیلئے بہت سے تحفے خریدے اور پہننے کیلئے کپڑے بنا کر دیئے تھے۔ عائشہ خوش تو بہت تھی، مگر یہ بات اس کو ذرا نہ بھاتی تھی کہ اس کا بیٹا باپ کے بغیر پیدا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ اگر وہ محبت کی پیداوار ہوتا، تو بات دوسری تھی اور قابل درگزر ہوتی۔ البتہ اسے پتہ تھا کہ عربوں میں زمانہ قدیم سے یہ خیال چلا آتا ہے کہ زنا بالجبر کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اولاد بہت جیدار ہوتی ہے۔

اوتا کی نظروں میں عائشہ بیک وقت بہت بہادر اور نہایت بیوقوف عورت تھی۔ بہادر اس لئے کہ وہ اپنی اولاد کی خاطر ہر قربانی کرنے کے لئے تیار تھی۔ اور بیوقوف اس لئے کہ اس کے خیالات ذرہ بھر قابل عمل نہ تھے۔ بچے کے بغیر اس کی مشکلات اتنی بے تحاشا تھیں کہ ختم ہوتی نظر نہ آتی تھیں۔ بچے کی موجودگی میں ان میں مزید اضافہ ہونے کی توقع تھی۔ ہم نے اسے کہہ رکھا تھا کہ اگر اسے کسی قسم کی مدد درکار ہو، تو بلا تردد ہمیں بتائے۔ اوتا کو افسوس ہو رہا تھا کہ ہم آرمینیا سے، جہاں پر ہمیں ابھی مزید ایک ہفتہ رکنا تھا، عائشہ کے لئے کچھ نہ کر سکتے تھے۔ ہمیں تو یہ بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اسے کس قسم کی ایمرجنسی درپیش تھی۔

خدا خدا کر کے سفر کا آخری ہفتہ اختتام کو پہنچا اور ہماری واپسی کا دن آیا۔ اوتا نے وہ سات دن جیسے دھکتے ہوئے کوئلوں پر گزارے تھے۔ ہوائی جہاز میں چار ہفتوں کے بعد ہمیں جرمن اخبارات پڑھنے کو ملے۔ گرمیوں میں جرمنی کی آدھی آبادی غیر ملکوں کی سیر و سیاحت پر نکلی ہوئی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ پارلمان بھی گرما کی تعطیلات مناتی ہے اور دو ماہ کیلئے اپنی کاروائی روک دیتی ہے۔ حکومت کے چھوٹے بڑے سب کارندے ملک سے غیر حاضر ہوتے ہیں اور ہر قسم کی سیاسی سرگرمیاں قریب قریب معطل ہو جاتی ہیں۔ جرمنی میں ان دنوں کو "ترش کھیروں کے موسم" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ خبروں کا اتنا مندا ہوتا ہے کہ جو بات عام حالات میں اخباروں میں جگہ نہیں پاتی، وہ بھی اس موسم میں پہلے صفحے پر جلی حروف میں چھپ جاتی ہے۔ اکثر اخباروں میں جرمنوں اور غیر ملکیوں کے باہمی تعلقات پر تبصرے چھپے ہوئے تھے۔ آخر کسی طریق سے صحافیوں کو اپنے کالموں کے پیٹ تو بھرنے تھے۔

ہماری واپسی شام کے وقت سورج غروب ہونے کے بعد ہوئی، اس لئے کسی سرکاری

دفتر سے رابطہ نہ کیا جا سکتا تھا اور عائشہ کے فون نمبر پر وہی ریکارڈ چل رہا تھا کہ اس نمبر کے تحت کوئی کنکشن نہیں ہے۔ اوتا نے کہا کہ ہمیں اگلے روز خود وہاں پر جا کر پتہ کرنا چاہیئے کہ عائشہ کدھر غائب ہوگئی تھی اور اس کی رہائش گاہ کا فون کیوں کٹ گیا تھا۔ اس وقت تک ہمارے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ کیسی خبر ہماری راہ تک رہی ہے۔

اگلی صبح ہم وہاں پر پہنچے، تو یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ عائشہ کے مکان کی طرف جانے والا راستہ بند تھا۔ ہم نے کار کو ایک قریبی سڑک پر چھوڑا اور پیدل چل کر مکان والی گلی میں داخل ہوئے۔ عائشہ کی رہائش گاہ جل کر راکھ ہو چکی تھی۔ عمارت کا صرف ڈھانچہ باقی تھا۔ جسکے سامنے پولیس کی کار راستہ روکے ہوئے کھڑی تھی۔ ہمارے پوچھنے پر ایک سپاہی نے بتایا کہ دس روز قبل وہ مکان آگ لگنے کے سبب جل گیا تھا۔ انسانی نقصان کے بارے میں اس نے کہا کہ کچھ لوگ مارے گئے تھے اور کچھ زخمی ہوئے تھے۔ مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے ہمیں پولیس کے ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کرنا ہوگا۔

وہاں پر جا کر پتہ چلا کہ عائشہ ہسپتال میں داخل تھی، کیونکہ اس نے آگ لگنے پر اپنے پہلی منزل پر واقع کمرے کی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر جان بچائی تھی۔ اس کوشش میں اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں۔ اس نے بازوؤں میں اپنا نوزائدہ بیٹا اٹھایا ہوا تھا، جسے حیرت انگیز طور پر کوئی مہلک زخم نہ آیا تھا اور وہ خیر و عافیت سے تھا۔ البتہ عائشہ کی حالت ابتدائی دنوں میں بہت مخدوش رہی تھی۔

ہم فوراً ہسپتال میں پہنچے۔ عائشہ کی حالت سنبھل گئی تھی۔ اسکی ٹانگوں کا اپریشن کامیاب رہا تھا اور وہ سہارے سے تھوڑا بہت چلنے لگی تھی۔ اسے ہماری آمد سے بہت خوشی ہوئی۔ اس نے حادثہ سے تیسرے روز ہمارے گھر پر فون کیا تھا، مگر اسے خیال نہ آیا تھا کہ اسے ہسپتال کا فون نمبر پیچھے چھوڑنا چاہیئے تھا۔ وہ بہت خوش تھی کہ اسکا بیٹا ہاشم معجزانہ طور پر بچ گیا تھا۔

اس نے بتایا کہ جب اس رات آگ لگنے پر دھویں کے سبب اس کی آنکھ کھلی اور وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر سیڑھیوں کی طرف بھاگنے کے خیال سے کوریڈور میں نکلی، تو وہاں پر دھواں اس قدر کثیف تھا کہ اسے کچھ نظر نہ آتا تھا اور سانس لینی مشکل تھی۔ اس لئے وہ واپس اپنے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ بند کر دیا۔

"میری آنکھوں کے سامنے موت کا بھوت ناچ رہا تھا"۔ عائشہ نے عربی اور جرمن کی

کھچڑی میں اور ہاتھوں کے اشاروں سے بتایا: "میں نے جلدی سے ہاشم کو اٹھایا اور اس کو اپنے بازوؤں میں بھینچ کر کھڑکی میں سے چھلانگ لگا دی"۔

نرس نے، جو وہاں پر ڈیوٹی دے رہی تھی، بتایا کہ عائشہ خوش قسمتی سے روٹو ڈنڈرون کی جھاڑی کے اوپر گری تھی، جس کی شاخوں نے اس کو سنبھال لیا تھا۔ وگرنہ وہ خود اپنے بوجھ تلے پس کر مر جاتی۔ بچے کو اس نے کمال ہوشیاری سے اس طرح اٹھا رکھا تھا کہ وہ زمین پر گرنے کی بجائے اس کے جسم سے چمٹا رہا اور زخمی ہونے سے بچ گیا۔

اس حادثے میں دس افراد زخمی ہوئے تھے اور چار جل کر مر گئے تھے۔ مرنے والوں میں گھانا کا وہ نوجوان بھی شامل تھا، جس نے عائشہ کے بیان کے مطابق اس پر مجرمانہ حملہ کیا تھا۔ لبنانی خاندان کا ایک لڑکا مارا گیا تھا، جبکہ فلسطینی فیملی کے سب افراد بچ گئے تھے۔ ان میں سے کوئی زخمی بھی نہ ہوا تھا۔ اس فیملی کے ایک نوجوان امین کی آنکھ بروقت کھل گئی تھی اور اس نے سب کو بیدار کیا تھا اور ان کو آگ سے بچانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے مکان کے دوسرے باسیوں کو بھی بچانے میں دلیری سے کام لیا تھا۔ پولیس نے اپنی پہلی رپورٹ میں اس کا ذکر خاص طور پر تعریفی رنگ میں کیا تھا۔ مگر دوسرے روز ریڈ کراس کے ایک ورکر نے بیان دیا کہ زخمیوں کو ہسپتال لے جاتے ہوئے امین نے کہا تھا کہ آگ انہوں نے لگائی تھی۔

جب امین سے اس بارے میں پوچھا گیا، تو اسنے بتایا کہ اسنے خود آگ لگانے کی بات نہیں کی تھی۔ صرف یہ کہا تھا کہ آگ "انہوں" نے لگائی تھی۔ اسکی مراد فاشسٹوں سے تھی، جو نئے نازیوں کے روپ میں جرمنی میں پھر سے سر اٹھا رہے ہیں۔ مگر سرکاری وکیل اس بارے میں کچھ سننے کیلئے تیار نہ تھا۔ اس نے امین کو مجرم قرار دیتے ہوئے مجسٹریٹ سے اسکا ریمانڈ حاصل کر لیا اور مزید تفتیش کی کارروائی کو روک دیا

مکان کے باسیوں کا کہنا تھا کہ ان کے درمیان کسی قسم کا کوئی لڑائی جھگڑا نہ تھا۔ البتہ یہ درست ہے کہ لبنانی اور فلسطینی خاندانوں کے درمیان کچھاؤ موجود تھا، مگر اتنا بھی نہیں کہ وہ ایک دوسرے کی جان کے پیاسے ہوں۔ مگر کیا وجہ تھی کہ فلسطینی خاندان کے سب افراد بچ گئے تھے اور ان میں سے کوئی زخمی بھی نہ ہوا تھا، جب کہ لبنانی فیملی کا ایک لڑکا آگ میں جل کر مر گیا تھا۔ سرکاری وکیل نے سوال کیا کہ کیا اس کے پیچھے کوئی منصوبہ کام نہیں کر رہا تھا؟

اس دوران میں صحافیوں نے سراغ لگایا کہ آگ لگنے والی رات پولیس نے چار

فاشسٹ نوجوانوں کو جائے وقوعہ کے قریب چیک کیا تھا، جو رات کے تین بجے اپنی کار کو دھکا لگا رہے تھے۔ وہ کسی ایسے پٹرول پمپ کی تلاش میں تھے، جو اس وقت کھلا ہو۔ پولیس کے دستے نے اپنی رپورٹ میں درج کیا تھا کہ ان میں سے تین نوجوانوں کے ماتھے پر گرنے والے بال اور انکی آنکھوں کی بھویں جھلسی ہوئی تھیں۔ انکے شناختی کارڈ چیک کرنے کے بعد انکو رہا کر دیا گیا تھا۔ سرکاری وکیل نے ان نوجوانوں کے خلاف تفتیش کرنا ضروری خیال نہ کیا۔ اس وقت بھی نہیں، جب انمیں سے ایک نے ایک صحافی کے سامنے اقرار کیا کہ وہ اور اسکے دوست اسایلم والے مکان کو آگ لگانے میں ملوث تھے۔

پورے ایک سال کی تحقیق و تفتیش کے بعد امین پر آگ لگانے اور قتل بالعمد کے الزام کے تحت مقدمہ چلا۔ سوائے ریڈ کراس ورکر کے بیان کے امین کے خلاف کوئی ثبوت پیش نہ کیا جا سکا۔ مکان کے باسیوں نے امین کے حق میں بیان دیئے۔ چنانچہ عدالت نے امین کو شبہ کا فائدہ دیتے ہوئے بری کر دیا۔

مقدمہ کی کاروائی کے دوران جب جل کر مرجانے والوں کے بارے میں سوال کیا گیا، تو سیرالیون کے ایک گواہ نے بیان دیا کہ اس کا دوست، جو گھانا کا رہنے والا تھا، بروقت مکان سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا، مگر چونکہ عائشہ کہیں پر دکھائی نہ دیتی تھی، اس لئے وہ اس کو اور اس کے بیٹے ہاشم کو بچانے کے لئے دوبارہ جلتے ہوئے مکان میں گھس گیا تھا۔ مگر اس دوران میں آگ نے زینے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور اس کے لئے واپسی کا راستہ مسدود کر دیا تھا۔

(ٹریر۔ ۱۵ جون ۲۰۰۱ء)

بے روزگار

میں آدھا گھنٹہ یونیورسٹی لائبریری کے گیٹ پر کھڑا اس کا انتظار کرتا رہا۔ پھر کیفے ٹریا میں چلا گیا کہ شاید کامریڈ وہاں پر بیٹھا ہو۔ مگر وہ کہیں پر نہیں تھا، حالانکہ ہم نے خاص طور پر اس روز ملنے کے لئے وقت مقرر کر رکھا تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں یہ چیز ہمارے روزمرہ کے معمول میں شامل تھی۔ عین پانچ بجے سارے دوست یار کیفے ٹریا میں پہنچ جاتے تھے۔ آدھ پون گھنٹے کی گپ شپ کے بعد ہر کوئی اپنے اپنے شعبے کی لائبریری میں اپنی سیٹ کی طرف لوٹ جاتا تھا۔ یہ سلسلہ چار پانچ برسوں تک جاری رہا، جس کے دوران ہر کوئی اپنی اپنی تحقیق و تعلیم کے خاتمے پر ڈگری لے کر یونیورسٹی کو خیر باد کہہ گیا۔ صرف کامریڈ اکیلا باقی بچا تھا، جو چالیس برسوں سے اس روایت کو زندہ رکھے ہوئے تھا۔ اس کے ساتھ میری ملاقات سال میں ایک آدھ بار سرراہے ہو جایا کرتی تھی اور وہ مجھے پانچ بجے کی چائے پر آنے کی دعوت دیا کرتا تھا، جس کو قبول کرنے کی گنجائش میرے روزمرہ کے معمول میں بالکل نہیں تھی۔ اس کا دل رکھنے کی خاطر میں نے اس سے وعدہ کر رکھا تھا کہ انسٹی ٹیوٹ سے پنشن لینے کے بعد میں اس کا ساتھ دیا کروں گا۔ چنانچہ ہم نے آپس میں یہ طے کیا تھا کہ ۳۰ نومبر کے روز ہم پانچ بجے یونیورسٹی گیٹ پر ملیں گے اور سابقہ دنوں کی یاد تازہ کرنے کے لئے کیفے ٹریا میں جا کر مجلس لگائیں گے۔

میں اس روز اپنا وعدہ پورا کرنے کے لئے آیا تھا۔ انسٹی ٹیوٹ میں وہ میرا آخری دن تھا۔ آدھا دن ساتھیوں سے فرداً فرداً رخصت لینے میں گذرا تھا۔ پچھلے پہر انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ایک الوداعی تقریب منعقد کی گئی تھی، جس کے لئے میں نے یہ شرط لگا رکھی تھی کہ اس کی کاروائی ساڑھے چار بجے تک مکمل ہو جانی چاہئیے۔ کیونکہ مجھے عین پانچ بجے یونیورسٹی لائبریری میں پہنچنا ہوگا۔ مگر میں نے کسی کو نہیں بتایا تھا کہ مجھے وہاں پر کامریڈ سے ملنا تھا۔

کامریڈ کو میں ہمبرگ میں اپنے قیام کے ابتدائی دنوں سے جانتا ہوں۔ پہلی بار میں نے اسے امریکن سنٹر کی لائبریری میں دیکھا تھا۔ مگر ہمارے درمیان کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی، بلکہ بہت دنوں تک ہمارا آپس میں تعارف ہی نہیں ہوا تھا۔ ہم بس ایک دوسرے کو دور دور سے کن

اکھیوں سے تکتے رہے تھے۔ اس زمانے میں برصغیر ہندو پاک کے طالب علم جرمنی میں بہت کم ہوتے تھا اور عام طور سے سب آپس میں گھل مل کر رہتے تھے ۔ پتہ نہیں ہم دونوں کیوں ایک دوسرے سے کترا رہے تھے۔ میری توجہ ان دنوں پوری طرح جرمن زبان سیکھنے پر مرکوز تھی اور میں اس کام کو فل ٹائم جاب کی طرح چلا رہا تھا۔ اس لئے میرا ملنا جلنا صرف ان طالب علموں تک محدود تھا، جو میرے ساتھ جرمن زبان کا کورس کر رہے تھے۔

ان میں اول نمبر پر فاروق تھا، جو میری طرح پاکستان سے تھا۔ اس کی ملاقات لندن میں ایک جرمن استانی کے ساتھ ہوئی تھی، جو وہاں پر گرمیوں کی چھٹیاں گذارنے گئی ہوئی تھی۔ فاروق نے سوچا کہ ایسی خود کفیل عورت روز روز ہاتھ نہیں لگا کرتی۔ وہ ہفتہ عشرہ میں ہی اسے گھیر گھار کر مسجد میں لے گیا اور نکاح پڑھوالیا۔ اس نے اپنے آپ کو ڈینٹسٹ سرجن مشہور کر رکھا تھا، جو صرف اس وجہ سے یہ کام نہیں کرتا کیونکہ اس کے ہاتھ کانپتے ہیں۔ درحقیقت اس کا اس پیشہ سے صرف اتنا تعلق تھا کہ اس کا باپ قصور میں زنبور سے کھینچ تان کر لوگوں کی داڑھیں نکالا کرتا تھا۔ اس کی اپنی کوالیفی کیشن بس اتنی تھی کہ اس نے دو بار فیل ہونے کے بعد میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ اس زمانے میں جرمنوں کو ہمارے نظام تعلیم کی کچھ ایسی خبر نہ تھی۔ اس وجہ سے میٹرک پاس کو جرمنی کی یونیورسٹیوں میں داخلہ مل جاتا تھا۔ باپ نے سوچا کہ بیٹا دو چار سال یورپ میں گذار آئے، تو اسے یورپ سے ڈگری یافتہ ڈینٹسٹ سرجن مشہور کر کے کام چل سکتا ہے۔ اسے کیا پتہ تھا کہ لندن میں ایک جرمن استانی اسکے بیٹے کی راہ تک رہی تھی، جو اسے پکڑ کر ہمبرگ لے جائے گی، جہاں پر فاروق کو جرمن جیسی مشکل زبان سیکھنی پڑے گی۔

میرا دوسرا کلاس فیلو پرکاش جنوبی ہندوستان سے تھا اور ڈاکٹری کرنے کے لئے وظیفہ دے کر بھیجا گیا تھا۔ اس کی مشکل یہ تھی کہ جرمن کا تلفظ اس کی زبان پر نہ چڑھتا تھا۔ بے چارہ سارا دن ایک آدھ لفظ کی درست ادائیگی پر صرف کر دیتا تھا۔ جب اس کو کلاس میں کچھ پڑھ کر سنانا پڑتا تھا، تو اس کے پسینے چھوٹ جاتے تھے۔ البتہ اس کو جرمن زبان کی گرائمر کے تمام قواعد ازبر تھے۔ صرف ان قواعد کا درست استعمال اس کے لئے بہت بڑا مسئلہ تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر وہ اپنی تعلیم کی تکمیل میں ناکام رہا، تو اسکا سبب صرف جرمن زبان ہوگی۔

ہماری چوکڑی کا تیسرا ساتھی مدن مالویہ تھا۔ اس کا خاندان تقسیم ملک سے پہلے میانوالی سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ دہلی سے بی۔ اے کر کے آیا تھا اور جرمنی میں بزنس ایڈمنسٹریشن کی تعلیم حاصل

کرنی چاہتا تھا۔ میں کلاس کے بعد اکثر اس کی اور فاروق کی معیت میں یونیورسٹی کیفے ٹریا میں جا کر بیٹھتا تھا۔ جہاں پر ہماری ملاقات گاہے بگاہے دوسرے ہندوستانی طالب علموں سے ہو جاتی تھی، جو ہم سے سینیر تھے اور جن کے ذریعہ ہمیں بہت سی کارآمد باتوں کا پتہ چل جاتا تھا، جن کا جاننا ہمارے لئے ضروری تھا، مگر جرمن زبان سے پوری طرح واقف نہ ہونے کے سبب وہ ہم پر پوشیدہ رہتی تھیں۔

دسمبر کا مہینہ آیا، تو میں نے کرسمس کی چھٹیاں ڈنمارک کے دارالسلطنت کوپن ہیگن میں گذارنے کا ارادہ کیا، جو ہمبرگ سے صرف پانچ گھنٹے کے فاصلے پر واقع ہے۔ ریل گاڑی کے کرائے پر اٹھنے والے پیسے بچانے کی خاطر میں نے سفر ہیچ ہائیکنگ کے ذریعہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے اس سے قبل ہیچ ہائیکنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور نہ ہی میں جانتا تھا کہ سردیوں میں ہیچ ہائیکنگ کا رواج نہیں ہے۔ اس بات کا اندازہ مجھے آوٹوبا ہن پر جا کر کھڑا ہونے کے بعد ہوا۔ دور دور تک سڑک پر میں اکیلا کھڑا تھا۔ کئی روز سے دھیمی دھیمی برف باری ہو رہی تھی اور قریب قریب ایک فٹ برف پڑ چکی تھی۔ میرے لئے برف باری سے نبرد آزما ہونے کا نیا نیا تجربہ تھا۔ میں نے ہاف بوٹ پہن رکھے تھے، جو اس زمانے میں میرا بوٹوں کا واحد جوڑا تھا، جو راولپنڈی سے میرے ساتھ آیا تھا۔ اور واضح ہے کہ اسے برف باری کا مقابلہ کرنے کیلئے نہیں بنایا گیا تھا۔ میرے پاؤں یخ ہو رہے تھے اور مجھے خطرہ تھا کہ آدھ پون گھنٹے تک مجھے وہاں پر انتظار کرنا پڑا، تو میرے پاؤں کی انگلیاں ٹھٹھر کر جم جائیں گی۔ اس لئے میں مسلسل ناچنے ٹاپنے میں لگا ہوا تھا تاکہ خون کی گردش جاری رہے۔ میں اس اچھل کود میں اس درجہ مصروف تھا کہ مجھے ایک کار کے رکنے کی خبر تک نہ ہوئی، جو ستر اسی گز کے فاصلے پر جا کر رکی تھی۔ ڈرائیور نے ہارن بجا کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔

گاڑی اسٹیشن ویگن تھی اور ڈرائیور ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اس کا کاروبار اورینٹ قالین بیچنے کا تھا۔ وہ اس روز ایک امیر خاندان کو ایرانی قالین دکھانے کے لئے جا رہا تھا۔ ایک اورینٹل باشندے کو ہیچ ہائیکنگ کے لئے سڑک پر کھڑا دیکھ کر اسے خیال آیا کہ اگر وہ مجھے ساتھ لیتا جائے، تو میری موجودگی میں اسے قالین کی اچھی قیمت مل سکتی ہے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں پاکستان سے ہوں، تو اس نے کہا کہ پاکستان اور ایران ہمسایہ ملک ہی تو ہیں۔ وہ مجھے ایرانی قالین فروش کے طور پر پیش کرے گا، جو خاص طور پر وہ قالین لے کر آیا ہے اور اب آگے کوپن ہیگن جا رہا ہے۔ اس نے کہا کہ اگر میں اس سلسلہ میں صرف اپنی موجودگی کے ذریعہ اسکی مدد کر دوں، تو وہ مجھے نہ

صرف ڈنمارک جانے والی فیری بوٹ میں چڑھا آئے گا، بلکہ ملنے والی زائد رقم میں سے دس فیصد بونس ادا کرے گا۔ میں نے کہا کہ یہ امر دھوکہ بازی کے مترادف ہوگا۔

"دھوکہ بازی کا نام بھی نہیں لیا جا سکتا۔ قالین کی قیمت تین ہزار مارک ہے۔ البتہ تمہاری موجودگی میں وہ لوگ چار ہزار بھی ادا کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے"۔

میں نے ملنے والی متوقع رقم کا دل ہی دل میں حساب لگایا اور اس ناٹک میں کردار ادا کرنے کی ہامی بھر لی۔ یوں بھی مجھے ڈنمارک جانے والی فیری بوٹ لینی تھی، جس کی روانگی چار گھنٹوں میں ہونی تھی اور میں بندرگاہ سے ایک سو کلومیٹر کے فاصلے پر کھڑا تھا اور قالین فروش کی کار کے سوا کوئی کار مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے نہیں رکی تھی۔ قالین خریدنے والی فیملی کا قصبہ راستے میں پڑتا تھا۔ وہ لوگ سچ مچ بہت امیر اور بے حد متواضع نکلے۔ انہوں نے کافی اور کیک کے ساتھ ہماری خاطر تواضع کی اور قالین کی دل کھول کر تعریف کی، جو ان کے دیوان خانے میں ایسا سج رہا تھا، جیسے خاص طور پر اس کے لئے بنایا گیا ہو۔ انہوں نے بھاؤ تاؤ کئے بغیر ہماری منہ مانگی قیمت ادا کر کے قالین خرید لیا اور مجھے بیٹھے بٹھائے ایک سو مارک مل گئے۔ ڈرائیور مجھے فیری بوٹ پر چڑھانے کے لئے بندرگاہ تک آیا۔ اس نے اپنی جیب سے فیری کا کرایہ بھی ادا کر دیا، کیونکہ اسے میری وجہ سے توقع سے بڑھ کر منافع ہوا تھا۔

فیری بوٹ پر میری ملاقات ایک ڈینش نوجوان سے ہوئی، جسے کوپن ہیگن سے گذر کر آگے کہیں جانا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ مجھے شہر کے عین وسط میں ریلوے اسٹیشن کے سامنے اتار دے گا، جہاں پر مجھے رات کا ٹھکانہ تلاش کرنے میں آسانی رہے گی۔ پھر اس نے ہنستے ہوئے کہا:

"ہوسکتا ہے کہ تمہارے کالے بالوں اور کالی آنکھوں کو دیکھ کر کوئی بلونڈ ڈینش لڑکی تم پر فریفتہ ہو جائے اور تمہیں کرسمس کا تحفہ جانتے ہوئے اپنے ساتھ گھر لے جائے"

"مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں ہے، مگر کیا میں تمہاری بات کو رشک کا نام دوں یا حسد کا؟"

"جو تمہارا جی چاہے کہو۔ مجھے یہ پتہ ہے کہ اگر میں پورا سال دھوپ میں پڑا رہوں، تب بھی میری چمڑی کی رنگت ایسی براؤن نہیں ہوسکتی، جیسی تمہاری ہے"۔

فیری بوٹ ڈنمارک پہنچی، تو برف باری زوروں پر تھی۔ البتہ سڑکوں پر سے برف صاف کرنے والی گاڑی کے پیچھے پیچھے ہماری کار کسی دقت کے بغیر کوپن ہیگن پہنچ گئی۔ نوجوان نے مجھے ریلوے اسٹیشن کے سامنے اتارا۔ میں نے اپنے گرد و پیش پر ایک نظر ڈالی اور بالمقابل والے

ریستوران میں جا کر کافی پینے کا ارادہ کیا۔

ریستوران کی بار پر اچھا خاصا جمگھٹا تھا۔مگر میری نظریں کسی خالی میز کی تلاش میں تھیں۔ ایک ایسی میز مجھے ایک کونے میں مل گئی، جس کے پہلو میں ہیٹنگ لگی ہوئی تھی۔ میں ڈنمارک کی غیر معمولی سردی کے سبب ٹھٹھر رہا تھا۔اس لئے مجھے وہ میز بہت مناسب لگی۔ وہاں سے میں اپنا رکسیک بھی نظر میں رکھ سکتا تھا۔

میں نے کافی کا آرڈر دیا اور ابھی اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا کہ ریستوران کا دروازہ کھلا اور سیگریٹ کے دھویں اور شراب کی بو سے ملی جلی کثیف ہوا میں، جسے تلوار سے کاٹا جا سکتا تھا، تازہ ہوا کا ایک جھونکا اندر در آیا۔اس کے جلو میں ایک لڑکی داخل ہوئی۔لڑکی کا ناک نقشہ خاصا تیکھا تھا۔ نیلی آنکھیں، بلونڈ بال، چھریرا بدن، نکلتا ہوا قد، عمر بیس بائیس برس کے لگ بھگ، صحت مند، پر اعتماد۔اس نے ریستوران کی ساری میزوں پر سرسری نظر دوڑائی، جن پر بیٹھے ہوئے مرد للچائی ہوئی نظروں سے اس کی سمت تک رہے تھے۔ایک دو دل پھینک نوجوانوں نے اس کو اپنی میز پر آ کر بیٹھنے کے لئے اشارے بھی کئے۔مگر لڑکی ان کو نظر انداز کرتے ہوئے میری میز کی طرف بڑھی، جہاں پر میں اکیلا بیٹھا تھا۔اس نے ڈینش میں کچھ کہا، جس کو میں سمجھ نہ سکا۔ وہ یقیناً جاننا چاہتی تھی کہ کیا میری میز کی کوئی کرسی خالی ہے۔ میں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا اور انگریزی میں اس کو خوش آمدید کہا۔اس نے اپنا اوورکوٹ اتار کر کرسی کی پشت پر ڈال دیا۔اس نے خاصا تنگ پل اوور پہن رکھا تھا، جس کے سبب اس کے سینے کا ابھار نمایاں ہو گیا تھا۔اتنے میں بیرا میرے لئے کافی کی پیالی لے کر آیا۔لڑکی نے بھی اپنے لئے کافی کا آرڈر دیا اور کھانے کے لئے کیک لانے کو کہا۔

" کیا تم ہندوستان سے ہو؟" اس نے انگریزی میں جاننا چاہا۔

" پاکستان سے " میں نے دو لفظی جواب دیا۔

" تم میرے پہلے پاکستانی ہو۔اب تک میری ملاقات صرف ہندوستانیوں سے ہوتی رہی ہے۔ایک کے ساتھ تو میری اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی، مگر وہ اپنی تعلیم کی تکمیل کے سلسلے میں جرمنی چلا گیا تھا۔اس کا آخری خط مجھے ہمبرگ سے ملا تھا، جہاں پر اس کو یونیورسٹی میں داخلہ ملا تھا"۔

" یہ بھی خوب رہی۔ میں بھی ہمبرگ یونیورسٹی میں ہی پڑھتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میں تمہارے دوست کو جانتا ہوں"۔

"وہ تمہاری طرح چشمہ لگاتا ہے۔عمر اور قد بت میں بھی تم جیسا ہے۔اگر تم کل تک یہاں پر ہو، تو میں تمہیں اس کی تصویر دکھاؤں گی ، جو اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔مگر یہ بتاؤ کہ تم اس سردی کے موسم میں کوپن ہیگن کیسے آن نکلے ہو؟"

"میں کرسمس کی چھٹیاں گذارنے آیا ہوں اور تین چار روز کے قیام کے بعد واپس لوٹ جاؤں گا"۔

" کرسمس میں یہاں پر برف باری کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔بس آج کے روز شہر میں کچھ رونق رہے گی ، کیونکہ دوکانیں کھلی ہوئی ہیں اور لوگ آخری وقت پر تحفے تحائف خرید رہے ہیں۔ آج شام سے سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند ہو کر بیٹھ جائیں گے۔خوب شراب نوشی کریں گے اوز بطخیں اور خرگوش روسٹ کر کے کھائیں گے۔ مجھے خطرہ ہے کہ تم اچھے وقت پر اس شہر میں نہیں آئے ہو"۔

"میں اگر نہ آتا، تو میری ملاقات تم سے کیسے ہوتی ؟"

"ہاں یہ تو ہے۔مجھ سے ملے بغیر تمہاری زندگی یقیناً بے رونق رہتی"۔

"چلو اس بات کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ کیا مجھے یہاں پر کوئی چھوٹا موٹا ہوٹل مل جائے گا، جس کا کرایہ میری جیب ادا کرنے کے قابل ہو؟"۔

اس نے ایک ہوٹل کے بارے میں بتایا، جو وہاں سے زیادہ دور نہ تھا۔وہاں پر اکثر غیر ملکی اسٹوڈنٹ آن کر ٹھہرا کرتے تھے۔اس نے کہا کہ اسے اس شام کوئی کام درپیش نہیں تھا اس لئے وہ میرے ساتھ چلنے کو تیار تھی ۔ مجھے کوپن ہیگن میں وارد ہوئے ابھی آدھ پون گھنٹہ بھی نہ ہوا تھا کہ انگریڈ جیسا خوبصورت راہنما مل گیا۔

ہوٹل کے راستے میں انگریڈ نے بتایا کہ اس کے ماں باپ ایک دوسرے قصبے میں رہتے ہیں۔البتہ وہ ان دنوں آسٹریلیا کی گرمیوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے وہاں پر گئے ہوئے ہیں۔اس وجہ سے اس نے گاؤں جانے کی بجائے کرسمس کا تہوار کوپن ہیگن میں گذارنے کا ارادہ کیا تھا۔اس کے دوستوں نے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دے رکھی تھی ۔اس کا خیال تھا کہ اگر وہ مجھے اپنے ساتھ ان کے ہاں لے جائے ،تو اس کے دوستوں کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

ہوٹل میں کمرہ لینے اور رکسیک کو وہاں پر چھوڑنے کے بعد ہم انگریڈ کے دوستوں کے گھر پر پہنچے ،تو انہوں نے کھلے دل کے ساتھ مجھے خوش آمدید کہا، جیسے وہ میری راہ تک رہے ہوں ۔ گئے

اور انگریڈ کسی آفس میں سیکرٹری اور کولیگ تھیں، جب کہ بیورن میری طرح یونیورسٹی میں پڑھتا تھا ۔البتہ اس کی باتوں سے پتہ چلا کہ وہ دنیا جہان کی سیاحت کر چکا تھا۔ وہ پاکستان کے چپے چپے سے واقف تھا اور مجھ سے زیادہ اس ملک کو گھوم پھر کر دیکھ چکا تھا۔ میں نے اس وقت تک ابھی پاکستان کو دیکھا ہی کہاں تھا۔ لے دے کے ملک کے تین چار شہر دیکھے تھے اور شمالی پنجاب کے کچھ حصوں میں گھوما پھرا تھا اور بس۔ بیورن نے سندھ میں کسی عرس کے موقعے پر فقیروں کو دھکتے ہوئے انگاروں پر چلتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان کی شہ پر اور یہ یقین دلانے پر کہ اس کو کوئی گزند نہیں پہنچے گی، وہ خود بھی انگاروں پر سے گذر گیا تھا۔ میں نے کہا کہ اس کے پیچھے کوئی معجزہ کارگر نہیں تھا۔ فقیروں نے بیورن کو بتایا تھا کہ یہ انکے سائیں کی برکت کے سبب تھا۔

آدھی رات کے لگ بھگ انگریڈ مجھے ہوٹل میں چھوڑ گئی۔ اس نے کہا کہ وہ مجھے اگلے روز کوپن ہیگن کی سیر کرائے گی اور میوزیم دکھائے گی ۔ پتہ چلا کہ کرسمس کے روز میوزیم اور آرٹ گیلری کھلے ہوں گے۔ بلکہ اس روز داخلہ مفت ہوگا۔ چنانچہ دوسرے اور تیسرے روز انگریڈ میرے ساتھ ساتھ رہی۔ اس نے مجھے اپنے ہندوستانی دوست کی تصویر بھی دکھائی۔ یہ وہی شخص تھا، جس کو میں متعدد بار امریکن سینٹر کی لائبریری میں دیکھ چکا تھا۔ انگریڈ نے اس کا نام شیام بتایا اور کہا کہ وہ پکا کمیونسٹ ہے۔ اسلئے دوست یار اسکو کامریڈ کے نام سے پکارتے ہیں۔ پھر اس نے کہا کہ کامریڈ کے جرمنی جانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ کارل مارکس کی کتاب "دس کاپیٹال" کو جرمن زبان میں پڑھنے کا خواہشمند تھا۔ وہ یہ کہہ کر گیا تھا کہ وہ اسٹالن پر ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد واپس لوٹے گا

ہمبرگ واپس پہنچ کر میں کامریڈ سے ملنے کے لئے امریکن لائبریری میں گیا۔ اسے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ کوپن ہیگن میں میری ملاقات انگریڈ کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ لڑکی ایسی ہے، جس کے ساتھ مل کر انسان گھوڑے چرانے کی جرات کرسکتا ہے۔ مگر وہ اپنا وطن چھوڑ کر اس کے ساتھ ہمبرگ آنے کے لئے تیار نہ ہوئی تھی۔ اس نے کہا کہ اگر کبھی شادی کرنے کا خیال اس کے دل میں آیا، تو وہ سب سے پہلے انگریڈ کو جا کر پروپوز کرے گا۔ فوری طور پر کامریڈ کے سامنے جرمنی میں قدم جمانے کا مسئلہ تھا۔ اس نے جرمن زبان کا امتحان پاس کر لیا تھا اور اس کو پولیٹیکل سائنس کے شعبے میں داخلہ بھی مل گیا تھا۔ وہ مجھ سے ایک سمسٹر آگے تھا۔

اس سال جرمنی میں ریکارڈ سردی پڑی تھی، جس کے سبب مجھ جیسے طالب علموں کو، جن کو وظیفہ نہیں ملتا تھا اور جن کو جرمن ابھی اتنی اچھی نہیں آتی تھی کہ کسی دفتر میں لکھنے پڑھنے کا کام کر

سکیں، مزدوری حاصل کرنے میں دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ کامریڈ نے کہا کہ وہ مجھے اس جگہ پر ملازمت دلاسکتا ہے، جہاں پر وہ خود کام کر رہا تھا۔ اس نے کہا کہ میں اگلے روز صبح سویرے اس کے ساتھ چلوں۔ اسے یقین تھا کہ مجھے وہاں پر رکھ لیا جائے گا۔ اس کا خیال تھا کہ گودام کا چوکیدار کمیونسٹ تھا۔ چونکہ مغربی جرمنی میں کمیونسٹ پارٹی کو غیر قانونی قرار دیا جا چکا تھا، اس لئے لوگ کھلے بندوں کسی کو نہیں بتاتے تھے کہ وہ کامریڈ ہیں۔ مگر انسان ان کی باتوں سے اس چیز کو جان جاتا تھا۔

اگلی صبح ہم پانچ بجے انڈر گراونڈ ریل گاڑی کے اسٹیشن پر ملے۔ میں اس سے قبل کبھی اتنی صبح کام پر نہیں گیا تھا۔ اس لئے مجھے پتہ نہ تھا کہ اسٹیشن پر اس قدر بھیڑ ہوگی۔ جرمنی میں مزدور لوگ بہت سویرے کام شروع کرتے ہیں۔ پہلی گاڑی چار بجے چلتی ہے اور سنا ہے کہ کھچا کھچ بھری ہوتی ہے۔ کامریڈ اس بات کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ مجھے بندرگاہ کے گوداموں کے ایک تہہ خانے میں لے گیا، جو چند ماہ قبل سیلاب کی زد میں آ گیا تھا اور کئی روز تک پانی کی نکاسی ممکن نہ ہوسکی تھی۔ اس وجہ سے وہاں پر رکھے ہوئے ڈبوں کو زنگ لگ گیا تھا۔ ان ڈبوں میں انا ناس، آم، رس بھریاں اور دوسرے پھل اور کئی قسم کی سبزیاں تھیں۔ چونکہ زنگ آلودہ حالت میں ڈبوں کر بیچنے کیلئے دوکانوں پر نہ رکھا جا سکتا تھا، اسلئے متعلقہ کمپنی نے گودام کے چوکیدار کو ڈبوں کا زنگ اتارنے کیلئے تین چار طالب علموں کی خدمات حاصل کرنے کی ہدایت کی تھی۔ کامریڈ کے علاوہ وہاں پر دو ہفتوں سے ایک لمبا دھڑنگا جرمن لڑکا اور ایک پستہ قد موٹی سی لڑکی کام کر رہے تھے۔ چوکیدار نے مجھے بھی رکھ لیا۔ ہمارے سپرد زنگ کو ریگمار کاغذ سے کھرچنے اور صاف کرنے کے بعد ڈبوں پر نئے لیبل لگانا تھا۔ اس کام کیلئے کسی قسم کی فنی مہارت کی ضرورت نہیں تھی اور نہ ہی کوئی سپروائزر ہمارے سروں پر کھڑا تھا۔ اسلئے ہمارے ہاتھ کام میں مصروف ہوتے تھے، مگر ہماری باتیں بین الاقوامی سیاسی حالات کے گرد گھوم رہی ہوتی تھیں۔ ہم نے کانگو سے لے کر کیوبا تک کے مسائل پر، جو ان دنوں بین الاقوامی سیاست میں اہمیت رکھتے تھے، دل کھول کر ایک دوسرے سے بحث مباحثہ کیا۔

مغربی جرمنی کے طالب علموں کے اندر اس زمانے میں بائیں بازو کے لئے خاص ہمدردیاں پائی جاتی تھیں۔ جس کے پیچھے شاید یہ چیز کام کر رہی تھی کہ نوجوان اپنے ماں باپ کے نازی ماضی سے لاتعلقی دکھانا چاہتے تھے۔ کامریڈ کو بھی کچھ ایسا ہی جذبہ یورپ لایا تھا۔ اس کا باپ محکمہ ڈاک میں کسی بڑے عہدے پر تھا اور گھر میں بھی افسری دکھاتا تھا۔ کامریڈ اس کو "کالا صاحب

" کہہ کر یاد کرتا تھا۔ جس کے ساتھ بات کرتے ہوئے اسے "سر" کہنا پڑتا تھا۔ اس نے کہا کہ اس کے باپ کو یہ بات بھول چکی تھی کہ وہ ایک ایسے غریب کسان کا بیٹا تھا۔ جس کو ساری عمر کبھی پیٹ بھر کر روٹی نصیب نہ ہوئی تھی۔ کامریڈ کا باپ اپنے بچوں کو صبح سویرے سیر کے لئے لے کر جاتا تھا، جس کے دوران ان کو ایک دوسرے کے ساتھ شرط لگا کر دوڑ لگانی ہوتی تھی۔ اگر کبھی اس کا چھوٹا بھائی، جو اس کے مقابلے میں زیادہ صحت منداور کھلاڑی ٹائپ تھا، دوڑ میں اس سے آگے نکل جاتا تھا، تو باپ چھڑی سے کامریڈ کی پٹائی کر دیتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر وہ اپنے چھوٹے بھائی کا مقابلہ نہیں کر سکتا، تو پھر زندگی کی دوڑ کیسے جیتے گا۔ کامریڈ نے کہا کہ وہ اس دوڑ میں شامل ہی نہیں ہونا چاہتا۔ یہ بات اس کے باپ کو سخت ناپسند تھی۔ اس وجہ سے باپ بیٹے کے درمیان دن رات کشمکش چلتی رہتی تھی۔ آخر میں تنگ کر ایک روز کامریڈ گھر سے بھاگ گیا۔ وہ اس زمانے میں کلکتہ میں رہتے تھے۔ وہ سیدھا بندرگاہ میں گیا، جہاں پر اس کو ایک بحری جہاز کے کچن میں مددگار کی اسامی پر رکھ لیا گیا۔ جب ایک سفر کے دوران اس کا جہاز کوپن ہیگن میں آ کر رکا، تو وہ چپکے سے اپنا بیگ اٹھا کر وہاں پر اتر گیا۔ اس شہر میں اس نے بہت پاپڑ بیلے اور دکھ سکھ دیکھا۔ وہیں پر اس کی ملاقات کمیونسٹ مزدوروں کے ساتھ ہوئی، جن کی وساطت سے اسے سوشلزم پر کتابیں پڑھنے کو ملیں۔ پھر اس کے دل میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کا خیال سمایا۔ اس نے سوچا، کیوں نہ لگے ہاتھوں اسی موضوع پر تحقیق کی جائے۔ اسٹالن اس کا انقلابی ہیرو تھا۔

جرمن طالب علم آرنولڈ نے کہا کہ وہ مشرقی جرمنی کیوں نہیں چلا جاتا، جہاں پر اس زمانے میں کمیونسٹوں کی حکومت تھی۔ آرنولڈ وہیں کا رہنے والا تھا اور وہاں سے جان بچا کر بھاگا تھا۔ اس کو مشرقی برلن کی ہومبولڈ یونیورسٹی میں داخلہ دینے سے انکار کر دیا گیا تھا، کیونکہ وہ مزدور یا کسان خاندان کا سپوت نہیں تھا۔ اس کا باپ، جو ڈاکٹر تھا، دوسری عالمگیر جنگ میں مارا گیا تھا اور آرنولڈ کو اس کی ماں نے محنت مزدوری کر کے بہت مشکل حالات میں پالا پوسا تھا۔ اس کے باوجود اس کے خاندان کا شمار انٹیلکچول میں ہوتا تھا، جن کے بچوں کا داخلہ پارٹی نے یونیورسٹی میں بند کر رکھا تھا۔

کامریڈ کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ مشرقی جرمنی میں اس کو ویسی آزادی میسر نہیں ہوگی، جس کا وہ مغربی یورپ میں رہتے ہوئے عادی ہو چکا تھا۔

آرنولڈ نے کہا: "وہاں پر تمہیں وظیفہ مل جائے گا۔ یوں بھی اس ملک میں کارل مارکس اور اسٹالن پر تحقیق کرنے کے بہتر مواقع موجود ہیں۔ کیوں یہاں پر اپنے اور دوسروں کے وقت کا حرج

کرتے ہو"۔

کامریڈ کے جواب دینے سے پہلے لڑکی اس کی حمایت میں بول اٹھی۔اس نے کہا: "شیام مغربی جرمنی میں رہتے ہوئے بھی مارکس اور اسٹالن پر تحقیقی کام کرسکتا ہے۔مشرقی جرمنی میں اس کو پارٹی لائن کی پابندی کرنی پڑے گی"۔

کامریڈ نے کہا کہ وہ کسی پارٹی کی چاکری کرنے کے لئے تیار نہیں۔وہ یوں بھی کمیونسٹ پارٹی کا ممبر نہیں۔بس اس کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہیں۔وہ اپنا کام ایک آزاد محقق کی حیثیت سے کرنا چاہتا ہے۔

ہماری باتوں کی بھنک کسی طرح چوکیدار کے کانوں میں پڑ گئی۔کیونکہ اس نے چھٹی کے وقت کامریڈ کو ایک طرف لے جا کر اس موضوع پر بات کرنے سے منع کر دیا۔اس نے کہا دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔کہیں ایسا نہ ہو کہ مالکوں کو پتہ چل جائے کہ تم کمیونسٹ ہو۔اس سے تمہارا تو کچھ نہیں بگڑے گا،مگر میری نوکری جاتی رہے گی۔

مجھے انہی دنوں میں یونیورسٹی میں ایک جاب مل گئی، جہاں پر مجھے یہ سہولت حاصل تھی کہ میں حسب ضرورت اپنے مضمون کے لیکچروں اور سیمیناروں میں شامل ہوسکتا تھا۔اس طرح کئی ماہ تک کامریڈ سے میری ملاقات نہ ہوئی۔عام طور سے سال کے آخری دنوں میں غیر ملکی طالب علموں کے لئے،جن کو کرسمس کی چھٹیوں میں کہیں پر نہیں جانا ہوتا تھا،آؤٹنگ کا انتظام کیا جاتا تھا۔ اس سال کا پروگرام بریمن شہر کی سیر اور آگے بریمر ہافن میں جا کر اوپیرا دیکھنے کا تھا۔میں بس میں سوار ہوا،تو میری نظر کامریڈ پر پڑی، جو آخری سیٹ پر گودام والی لڑکی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں نے گرم جوشی سے میرا سواگت کیا اور مجھے اپنے ساتھ والی سیٹ پر آ کر بیٹھنے کی دعوت دی۔

پتہ چلا کہ گودام کا کام دو ماہ تک چلتا رہا تھا۔جسکے خاتمے تک کامریڈ کو اپنی ساتھی لڑکی سے اتنی شدید محبت ہو چکی تھی کہ انہوں نے مشترکہ فلیٹ لینے کا فیصلہ کیا تھا۔وہ بہت جلد شادی کرنے والے تھے،کیونکہ مارتھا حمل سے تھی۔میں نے سرگوشی میں کامریڈ سے پوچھا کہ انگریڈ کو کوپن ہیگن جا کر پروپوز کرنے والی بات اسکے ذہن سے اتر تو نہیں گئی؟

"نہیں یہ بات نہیں۔بس کچھ یوں ہے کہ انسان کچھ سوچتا ہے اور قدرت کچھ اور فیصلہ کر دیتی ہے"۔

خوبصورتی میں مارتھا کسی طرح بھی انگریڈ کا مقابلہ نہ کرسکتی تھی۔مگر یہ بات بھی تو تھی کہ

محاورے کے مطابق ہاتھ میں آیا ہوا ایک کبوتر ان دو کبوتروں سے بہتر ہے، جو منڈیر پر بیٹھے ہوں۔ میں نے ان کو مبارک باد دی اور کہا کہ مجھے اپنی شادی پر بلانا نہ بھولیں۔

مگر جب اگلی بار میری ملاقات کامریڈ اور مارتھا کے ساتھ ہوئی، تو ان کی بیٹی اڑھائی برس کی ہو چکی تھی۔ مارتھا کسی آفس میں سیکرٹری تھی اور اپنے خاندان کا واحد کماؤ فرد تھی۔ اس نے کہا کہ شیام کو اس کی طرف سے پوری آزادی ہے کہ پیسہ کمانے کی طرف سے بے فکر ہو کر جب تک چاہے اپنے تحقیقی کام کو جاری رکھے۔ خاندان کے لئے روزی کمانے کے لئے وہ کافی ہے۔

کامریڈ اس دوران میں بائیں بازو کی جماعتوں کی سیاست میں ملوث ہو چکا تھا، جو اس زمانے میں جلسوں اور جلوسوں کے ذریعہ معاشرے میں خوب ہلچل پیدا کرنے کا باعث بن رہی تھیں۔ وہ اکثر جلوسوں کی پہلی قطار میں دیکھا جاتا تھا اور دوسروں سے بڑھ چڑھ کر نعرے لگایا کرتا تھا۔ جب ہم پانچ بجے کیفے ٹریا میں چائے کیلئے اکھٹے ہوتے تھے، تو وہاں پر بھی وہ سیاسی موضوعات کو لے کر بیٹھ جاتا تھا۔ یہ چیز بعض دوستوں کو ناپسند تھی، اس وجہ سے انہوں نے وہاں پر آنا چھوڑ دیا۔ کامریڈ کو ان لوگوں کی کچھ پرواہ نہ تھی۔ وہ ان کو ریڑھ کی ہڈی سے عاری قرار دیتا تھا، جن کے دماغ فالج زدہ تھے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ غلامی کے سد باب میں خود غلام سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ وہ اس طرز زندگی کے اس درجہ عادی ہو چکے ہیں کہ وہ معاشرے میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں چاہتے۔

انہی دنوں میں اولگا ہمارے گروپ میں شامل ہوئی۔ وہ بلغاریہ کی رہنے والی تھی۔ شروع میں میرا خیال تھا کہ وہ اس وجہ سے ہماری محفل میں آئی تھی، کیونکہ ہم لوگ اس کی طرح غیر ملکی تھے۔ مگر آہستہ آہستہ میرے دل میں یہ شبہ جگہ پکڑنے لگا کہ اس کی توجہ کا مرکز دراصل کامریڈ تھا، جس کی ہر بات کو وہ آسمانی وحی کی طرح قبول کرتی تھی۔ میں نے اس بارے میں کامریڈ سے کبھی بات نہ کی۔ یوں بھی اسکے اندر ایک تبدیلی پیدا ہوتی جا رہی تھی، جس کا تعلق لڑکیوں سے اسکے معاملات سے تھا۔ اگر کیفے ٹریا میں اس کی نظر کسی لڑکی پر پڑ جاتی تھی، جو سگریٹ کو منہ میں دبائے ہوئے اس کو سلگانے کے لئے اپنے پرس میں دیا سلائی تلاش کر رہی ہوتی، تو وہ تیر کی طرح اپنی جگہ سے لپک کر وہاں پر پہنچ جاتا تھا اور لڑکی کے ہاتھ سے دیا سلائی لے کر اس کو سگریٹ سلگانے کیلئے آگ دیتا تھا۔ اس کی یہ حرکت دوسروں کو اتنی اوپری لگتی تھی کہ جو کوئی دیکھتا تھا، اسکا منہ کھلا رہ جاتا تھا۔ حتیٰ کہ لڑکیاں بھی اسکا مذاق اڑانے لگیں۔ وہ جان بوجھ کر سگریٹ کو منہ میں دبا کر بیٹھ جاتی تھیں، جیسے اس انتظار میں ہوں کہ کامریڈ اٹھ کر ان کیلئے دیا سلائی جلائے۔

اس دوران میں میرا مقالہ مکمل ہوگیا اور میں اس کی منظوری کے بعد یونیورسٹی سے فارغ ہو کر ایک تحقیقاتی ادارے میں ریسرچ فیلو لگ گیا، جس کا دفتر یونیورسٹی کے علاقے میں تھا۔ مگر میری مصروفیات اب ایسی تھیں کہ میں پانچ بجے کی چائے پر حاضر نہ ہوسکتا تھا۔ اس طرح کامریڈ سے میرا ملنا جلنا بہت کم ہوگیا۔ بس کبھی کبھار راستے میں ہمارا اتفاقاً ملنا ہوتا تھا اور وہ مجھے بتاتا تھا کہ اس کا مقالہ کیسا چل رہا ہے اور اس کی زندگی کیسے گذر رہی ہے۔ اس کا مقالہ پہلی بار نامنظور ہوگیا تھا، جس کے پیچھے شاید یہ چیز کارگر تھی کہ کامریڈ نے اسٹالن کو اونچے چبوترے پر بیٹھا دیا تھا۔ پروفیسر نے کہا کہ تم تو اسٹالن پر ایمان لے آئے ہو، جس کے سبب تنقید کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اس کی کمزوریوں اور چالاکیوں پر بھی تم کو نظر ڈالنی چاہئیے۔

اس دوران میں سویٹ یونین میں غروشوف نے اسٹالن کی ذات اور اس کی پالیسیوں پر تنقید کر کے اس کی شخصیت کا قلع قمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ چیز کامریڈ کے لئے بہت تکلیف دہ تھی۔ البتہ مشرقی جرمنی کی حکومت بدستور اسٹالن کی وفاداری کا دم بھرتی تھی۔ اس لئے کامریڈ نے سوچا کہ وہاں سے اس کو اپنے مقالے کے لئے مواد اور شاید کمک مل سکے گی۔ مگر وہاں الٹا اس پر شبہ کیا جانے لگا کہ وہ مغربی جرمنی کے کسی اینٹی کمیونسٹ ادارے کا ایجنٹ تھا۔

اب جا کر کامریڈ پر یہ راز کھلا کہ تحقیق اور تحسین میں فرق ہے۔ اس کو اپنی زندگی کے اگلے دس برس قربان کرنے پڑے، تب کہیں جا کر اس کا مقالہ منظور ہوا۔ اس دوران میں اس کی عمر پینتالیس کی حد کو عبور کر چکی تھی، جس پر سے گذر جانے کے بعد انسان یورپ میں اپنا پروفیشنل کیریئر نہیں بنا سکتا۔ کامریڈ کے سلسلہ میں یہ مشکل بھی تھی کہ اس پر کمیونسٹ ہونے کی چھاپ لگ چکی تھی، جس کا دھلنا آسان نہ تھا۔ اس زمانے میں مغربی جرمنی میں کوئی تحقیقاتی ادارہ ایک کمیونسٹ کو ملازم رکھنے کے لئے تیار نہ تھا۔ کامریڈ کو اس بات کا احساس تب جا کر ہوا، جب ناؤ ڈوب چکی تھی۔

میں اس روز گھنٹہ بھر کیفے ٹریا میں بیٹھا ہوا کامریڈ کا انتظار کرتا رہا۔ میرے پاس اس کا ٹیلی فون نمبر نہیں تھا اور نہ ہی مجھے پتہ تھا کہ وہ کہاں پر رہتا ہے۔ ٹیلی فون ڈائرکٹری میں اس کا نام سرے سے درج ہی نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ٹیلی فون مارتھا کے نام پر لگوایا گیا ہو۔ مجھے مارتھا کے خاندانی نام کا علم نہیں تھا، جسکے تحت اندراج ہوگا۔ اس طرح میں اس شام بے نیل ومرام گھر واپس لوٹا۔

اگلی صبح میں دیر تک سویا رہا اور بستر پر پڑا ہوا اپنی ریٹائرمنٹ کی آزادی کے مزے لوٹتا رہا۔ اتنے برسوں کے بعد مجھے صبح سویرے منہ اندھیرے گھر سے نکل کر کہیں نہیں جانا تھا۔ مجھے کوئی

ضروری یا غیر ضروری کام درپیش نہیں تھا۔ نہ ہی مجھے کسی کا فون ریسیو کرنا تھا یا خود کسی کو فون کرنا، فیکس یا ای میل بھیجنا تھا۔ میں تو ذہنی طور پر اخبار بھی پڑھنے کے لئے تیار نہ تھا۔ مگر پھر عمر بھر کی عادت غالب آئی اور میں ناشتہ کرنے کے بعد اخبار کھول کر بیٹھ گیا۔ پہلے صفحے پر KGB کے ایک ایجنٹ کی گرفتاری کی خبر تھی۔ مجھے اس میں دلچسپی نہ تھی۔ جب سویٹ یونین نہ رہی، تو KGB کی اہمیت بھلا کیا رہ گئی۔ پھر بھی میں نے اچٹتی ہوئی نظر اس خبر پر ڈالی، جو شیام کے نام پر آن کر اٹک گئی۔ سویٹ یونین کے ایک سابقہ ایجنٹ نے ان لوگوں کی فہرست CIA کے حوالے کی تھی، جو جرمنی میں اسکی رہنمائی میں KGB کے لئے کام کرتے تھے۔ شیام کے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ اس کو بلغاریہ کی اولگا کے ذریعہ پھانسا گیا تھا۔ اور میں ان سارے برسوں کے دوران کامریڈ کو بے روزگار سمجھتا رہا تھا۔

(کمرفیلڈ۔ ۲۹ جنوری ۲۰۰۱ء)

نسبی اولاد

لڑکی مجھے پہلی نظر میں ہی بھا گئی۔اس میں غضب کی کشش تھی۔اسکے چہرے پر معصومیت کی جھلک تھی، جو عام طور سے ان چہروں پر نظر آتی ہے، جنہوں نے ابھی دنیا نہیں دیکھی ہوتی اور جن کا واسطہ زندگی کے گرم وسرد سے نہیں پڑا ہوتا۔ میرے پہنچنے سے قبل پہلا سیشن ختم ہو چکا تھا اور سمینار کے شرکاء شام کے کھانے کے بعد سیر سپاٹے کے لئے کلب سے باہر جا چکے تھے۔اس وقت وہ لوگ یقیناً قصبے کی باروں میں بیٹھے ہوں گے یا شاید موسیقی کی دھنوں پر ڈانس کر رہے ہوں گے۔ ہلڈے کو منتظمین نے میری آمد کا انتظار کرنے کو کہا تھا۔ مجھے پہنچنے میں دیر اس وجہ سے ہوئی تھی کہ راستے میں ایک نوجوان نے اپنے آپ کو ہماری گاڑی کے آگے پھینک کر خودکشی کر لی تھی۔ جب تک پولیس حادثہ کی رپورٹ درج نہیں کر لیتی، گاڑی کو آگے جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔اس قضیئے کو نپٹانے میں ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا۔اسکے بعد ہماری گاڑی کو سفر جاری رکھنے کی اجازت دی گئی، مگر اس عرصے میں ریلوے کے پروگرام میں اچھی خاصی گڑبڑ ہو چکی تھی۔ چونکہ اس کا سبب ہماری گاڑی تھی، اس لئے اس کو مزید تاخیر کا تازیانہ بھگتنا پڑا۔اس طرح میں سمینار کے پہلے سیشن میں شامل ہو سکا، نہ ہی شام کے کھانے میں شریک ہوا۔

اس روز موسم خاصا خوشگوار تھا۔اکتوبر کا مہینہ اختتام کو پہنچ رہا تھا۔خزاں اپنے جوبن پر تھی اور میں راستے میں دھوپ اور چھاؤں کا کھیل دیکھتا اور درختوں کے رنگ برنگے پتوں سے محظوظ ہوتا آیا تھا، جس کے سبب ایک جادوائی منظر پیدا ہو گیا تھا۔ پھر جب ایک پری نے کلب میں میرا استقبال کیا اور بتایا کہ وہ میری راہ تک رہی تھی، تو مجھے لگا کہ میں سچ مچ پرستان میں پہنچ گیا تھا۔

ہلڈے نے مجھے کمرے کی چابی دی اور کہا کہ میرا کھانا اوون میں گرم رکھا ہے۔ میں نے کہا کہ میں ریل گاڑی کی ڈائننگ کار میں کھا چکا ہوں۔

"پھر میری ڈیوٹی ختم ہو جاتی ہے" ہلڈے نے کہا:"البتہ آپ کو قصبے کی سیر کیلئے چلنے کا شوق ہے، تو میں خوشی سے آپ کا ساتھ دوں گی "۔

"میں ضرور چلوں گا اور اپنا سفری بیگ کمرے میں رکھنے اور منہ ہاتھ دھونے میں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگاؤں گا"۔ میں نے جواب دیا۔

ہرن آلب جرمنی کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، جس کی شہرت دراصل وہاں کے معدنی چشمے کی وجہ سے ہے، جس کا پانی کئی ہزار فٹ کی گہرائی سے نکلتا ہے۔ اس میں پائی جانے والی معدنیات کو بہت سی بیماریوں سے شفا دلانے کی صفت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ اس وجہ سے ہر سال ہزاروں انسان اس قصبے میں آ کر چند ہفتے گذارتے اور دن میں کئی بار چشمے کا پانی پیتے اور معدنی پانی کے تالاب میں نہاتے ہیں۔ ایسے مقامات ملک کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں۔ جہاں پر خصوصی کلینک بنے ہوئے ہیں، جس کے سبب ان قصبوں کا سیزن سارا سال چلتا ہے اور گرمیوں یا سردیوں پر منحصر نہیں ہوتا۔ زائرین اور مریض قصبے کی رونق کو بڑھانے کا موجب بنتے ہیں۔ ان قصبوں میں ریستورانوں، قہوہ خانوں اور کلبوں کی بھرمار ہوتی ہے، جو سرِشام بھر جاتے ہیں۔ دراصل ان قصبوں کی شہرت کا انحصار اس چیز پر ہوتا ہے کہ لوگ وہاں پر اپنی شامیں کہاں پر اور کیسے گذارتے ہیں۔ اسلئے قصبوں کے کرتا دھرتا نت نئی دلچسپیوں کے سامان پیدا کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ جرمنی کے بیشتر جوا خانے اور اونچے درجے کے چکلے ایسے ہی قصبوں میں پائے جاتے ہیں۔

ہمارا ارادہ اندرون قصبہ کا ایک چکر لگانے اور پھر کسی اچھی سی بار میں جا کر بیٹھنے کا تھا۔ مگر شام بھیگنے کے ساتھ ساتھ ہوا میں خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس لئے ہم نے پہلی بار میں داخل ہونے کا ارادہ کیا، جو ہمارے راستے میں آئے گی۔ ہمیں اپنی غلطی کا احساس بہت جلد ہو گیا، کیونکہ پہلی بار ہم جنس مردوں کے لئے مخصوص تھی۔ وہاں پر ہلڈے کے سوا کوئی دوسری عورت موجود نہ تھی۔ مردوں کے جوڑے ایک دوسرے کو پیار سے بازوؤں میں تھامے ہوئے ڈانس کر رہے تھے اور کھلے بندوں ایک دوسرے کو ہونٹوں پر چوم رہے تھے۔ ہم نے محسوس کیا کہ سب کی نظریں ہماری طرف لگی ہوئی تھیں، جو بار میں ایک عورت کی موجودگی پر پریشان لگتی تھیں۔ ہم نے وہاں سے کھسک جانے میں عافیت جانی۔

غلط بار میں جانے کی ذمہ داری چونکہ میری تھی، اسلئے ہلڈے نے کہا کہ اگلی بار کا انتخاب اس کا ہوگا۔ میں نے کہا دیکھ لینا کہ وہ ہم جنس عورتوں کی بار نہ ہو۔ ہلڈے نے کہا کہ وہاں پر وہ یوں بھی تم کو داخل نہیں ہونے دیں گی۔ ان دنوں ہم جنسی پر جرمن معاشرے میں بحث مباحثہ چل رہا تھا۔ اسلئے میں نے دل میں سوچا کہ اب ساری شام اس پر بات کرتے ہوئے گذرے گی۔ مگر میرا قیاس درست نہ تھا۔ ہلڈے کو اس موضوع میں دلچسپی نہ تھی۔ وہ اس نوجوان کے بارے میں جاننا چاہتی تھی، جس نے اپنے آپکو ریل گاڑی کے آگے پھینک کر خودکشی کر لی تھی۔

"اس کے بارے میں گاڑی میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا" میں نے جواب دیا: "ہوسکتا ہے کہ کل

کے اخبار میں تفصیلات چھپیں۔ مجھے اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ کسی مسافر کے لبوں پر خودکشی کرنے والے کیلئے ہمدردی کا ایک بول تک نہ آیا تھا۔ ہر کوئی اپنے اگلے کنکشن کے مس ہو جانے کا رونا رو رہا تھا۔ گارڈ اور ٹکٹ چیکر سارا وقت لوگوں کو نئے کنکشن ڈھونڈ کر دینے میں لگے رہے"۔

"خودکشی کی وارداتیں ان دنوں بہت ہو رہی ہیں"۔ ہلڈے نے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ وہ سارے کے سارے اس ریل گاڑی کے سامنے اپنے آپ کو پھینکتے ہیں، جس میں میں سفر کر رہا ہوتا ہوں" میں نے کہا: "میرے ساتھ تھوڑے عرصے میں تیسری بار ایسا واقعہ پیش آیا ہے"۔

ہلڈے کے خاندان میں بھی ایک واقعہ ہو چکا تھا۔ جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ معاملہ خودکشی کا تھا۔ اس کا تعلق اس کے باپ کی موت سے تھا، جو دو ہفتے قبل اپنے مکان کی مرمت کرتے ہوئے چھت پر سے گرنے سے وقوع میں آئی تھی۔ ہلڈے کے سوا دوسروں کا خیال تھا کہ وہ ترچھی چھت پر سے، جو بارش ہونے کی وجہ سے گیلی تھی، پھسل جانے کے سبب گر گیا تھا۔

"کیا تمہارے پاس اس بات کا کوئی ثبوت موجود ہے کہ تمہارے باپ کی موت اتفاقی حادثے کے سبب نہ ہوئی تھی؟"

"ہو سکتا ہے کہ میں اس بات کو عدالت میں ثابت نہ کر سکوں، مگر میرا دل کہتا ہے کہ اس کی موت کے پیچھے میری ماں کا ہاتھ تھا"۔

"تھوڑا پہلے تم نے کہا تھا کہ معاملہ خودکشی کا تھا۔ اب کہہ رہی ہو کہ تمہارے باپ کی موت میں ماں کا ہاتھ تھا"۔ میں نے حیران ہو کر کہا۔

"میں یہ کہہ رہی ہوں کہ ماں نے اسے خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میرے ماں باپ کے درمیان مستقل جنگ چلتی تھی"۔

معلوم ہوتا تھا کہ ہلڈے، جس کے چہرے پر مجھے معصومیت کی جھلک نظر آئی تھی اور میں نے گمان کیا تھا کہ اس کا ابھی زندگی کے گرم و سرد سے واسطہ نہ پڑا ہوگا، گھریلو خانہ جنگی کا خاصا لمبا تجربہ رکھتی تھی۔ اس نے بتایا کہ ماں اس کو باپ کے خلاف بڑھکاتی رہتی تھی۔ مگر اسے اس میں کامیابی نہیں ہوتی تھی۔ اکثر یہ ہوتا تھا کہ وہ ماں کی باتیں باپ کو بتا دیا کرتی تھی۔ باپ ہلڈے سے بہت پیار کرتا تھا اور وہ بھی اسے دل و جان سے چاہتی تھی۔ دوسری طرف ماں کو اس سے یہ شکایت رہتی تھی کہ وہ باپ کو اس پر ترجیح دیتی تھی۔

" گویا تم بچپن سے خاندانی کشمکش کا حصہ رہی ہو" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں پہلے دن سے طوفان کے مرکز میں تھی۔ بلکہ ان کی آپس میں شادی کا سبب میں ہی تھی۔ اگر ماں مجھ سے حمل سے نہ ہوتی، تو شاید وہ میرے باپ سے بیاہ نہ رچاتی۔ وہ گاؤں کے ایک دوسرے نوجوان کی محبت کا دم بھرتی تھی، مگر وہ اس سے شادی کرنے کے لئے تیار نہ تھا"۔

"اب بات میرے پلے پڑی ہے۔ ماں نے تمہارے باپ سے شادی تو کر لی تھی، مگر کسی اور کی محبت کو اپنے دل سے نہ نکال سکی تھی۔ اس بات کا خمیازہ عمر بھر تمہارے باپ کو بھگتنا پڑا"۔

ہم اپنی باتوں میں ایسے ڈوبے ہوئے تھے کہ ہمیں وقت گذرنے کا احساس تک نہ ہوا۔ بیرے نے بل لا کر میرے آگے رکھا اور میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی، تو بارہ بج رہے تھے۔ ہمارے آگے پیچھے کی میزیں خالی ہو چکی تھیں۔ صرف ایک جوڑا ہمارے علاوہ ابھی بیٹھا ہوا تھا، جو شاید پیار و محبت کی باتوں میں مصروف تھا۔ پیانو بجانے والا اپنی اداسی کو دبانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ ہم بل ادا کر کے سرد رات میں باہر نکل گئے۔ کلب وہاں سے زیادہ دور نہ تھا۔

اگلے روز کا پہلا سیشن میرے لئے مختص تھا، جس میں مجھے دو تقریریں کرنی تھیں۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میرا واپسی کا پروگرام تھا۔ مگر ہلڈے کی فرمائش پر میں نے شام کی ٹرین لینے کا ارادہ کیا۔ اس طرح مجھے اس کے ساتھ مزید چند گھنٹے گذارنے کا وقت مل گیا۔ ہلڈے نے بتایا کہ پبلک نوٹری اس کے باپ کا وصیت نامہ دو ہفتوں میں کھولے گا۔ اس کی ماں سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ باپ کہیں اپنی ساری جائیداد ہلڈے کے نام نہ کر گیا ہو۔

" کیا اب خانہ جنگی تمہارے اور ماں کے درمیان ہو گی؟" میں نے پوچھا۔

"میرے دل میں ماں کے ساتھ جھگڑنے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ لیکن میں بہر صورت یہ جاننا چاہتی ہوں کہ باپ کی خودکشی کے پیچھے کیا راز ہے"۔

"مجھے تمہارے خاندانی معاملات میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں ہے، تاہم اگر تم پسند کرو، تو مجھے بتانا کہ بالآخر اونٹ کس کروٹ بیٹھا تھا"۔

بہت دنوں تک ہلڈے کی طرف سے کوئی خبر نہ آئی اور میں نے بھی اس سے رابطہ کرنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ یوں بھی جرمن معاشرے میں لوگ اپنا تجسس قابو میں رکھتے ہیں۔ میں نے دل کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ اگر کچھ بتانے کو ہوتا، تو ہلڈے خط لکھتی یا فون کرتی۔ یہ الگ بات ہے کہ میرے دل میں ہلڈے سے ملاقات کی خواہش کا پودا جڑ پکڑ چکا تھا اور میں چاہتا تھا کہ پھر اس سے ملوں اور اس کے

ساتھ کچھ وقت گذاروں۔

جب چند ماہ کے بعد مجھے ہلڈے کے قصبے کے ایک نزدیکی شہر میں منعقد ہونے والے ایک سمینار میں تقریر کرنے کی دعوت ملی، تو میں نے ہلڈے کو خط لکھا کہ اگر وہ وہاں پر آ سکے، تو خوب ہوگا۔ اس نے واپسی ڈاک سے جواب دیا اور اپنے آنے کا مژدہ سنایا۔ اس نے لکھا کہ اس کی زندگی کا اونٹ ایک ایسی کروٹ بیٹھا تھا، جس کا اسے وہم وگمان بھی نہ تھا۔

ہلڈے سمینار کے دونوں روز میرے ساتھ رہی۔ اس کے چہرے پر بدستور معصومیت کی جھلک تھی، مگر کچھ جھریاں بھی نظر آنے لگی تھیں۔ پتہ چلا کہ اس کے باپ نے اپنی وفات سے صرف ایک ہفتہ قبل اپنی وصیت میں تبدیلی کی تھی، جس میں درج تھا کہ اگر DNA ٹسٹ کے ذریعہ ثابت ہو جائے کہ ہلڈے اس کی بیٹی ہے، تو وہ اس کی تمام جائیداد کی اکیلی وارث ہوگی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس کے دل میں یہ شبہ کیسے پیدا ہوا کہ وہ اس کی بیٹی نہیں۔ اس کا جواب صرف ماں دے سکتی تھی۔ مگر اس نے چپ سادھ لی تھی۔ جب اس پر زور ڈالا گیا، تو اس نے اقرار کیا کہ ایک گھریلو لڑائی جھگڑے میں اس کے منہ سے نکل گیا تھا کہ ہلڈے اس کی نہیں اس کے رقیب کی بیٹی ہے۔ ہلڈے کو یقین تھا کہ ماں کی اس بات نے باپ کو خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ماں کے تعلقات شادی سے پہلے اس کے باپ کے علاوہ اس کے رقیب سے بھی رہے تھے اور وہ خود بھی شاید نہیں جانتی تھی کہ وہ دونوں میں سے کس سے حمل سے تھی۔

"تو کیا تم نے DNA ٹسٹ کرایا؟" میں نے پوچھا۔

"پہلے تو میں اس کے خلاف تھی۔ مگر پھر پبلک نوٹری کے کہنے پر اس کے لئے تیار ہوگئی، کیونکہ اس کے بغیر وراثت کا فیصلہ نہ ہوسکتا تھا۔ ٹسٹ سے ثابت ہوگیا کہ میں باپ کی نسبی اولاد ہوں۔ جانتے ہو اسکا کیا مطلب بنتا ہے؟"

"مجھے پتہ نہیں کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو" میں نے جواب دیا۔

"باپ نے ماں کی اس غلط بیانی کے سبب خودکشی کی تھی کہ میں اسکی بیٹی نہیں ہوں، جبکہ درحقیقت میں اسکی نسبی اولاد ہوں۔ تم سوچ سکتے ہو کہ یہ جان کر مجھ پر کیا قیامت گذری۔ میرا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا۔ یہ وجہ تھی کہ میں تم سے رابطہ نہ رکھ سکی۔ مجھے کلینک سے واپس لوٹے ابھی تھوڑے دن ہوئے ہیں"۔

(کمرفیلڈ۔ ۲۰ اگست ۲۰۰۰ء)

جلاوطنی کی قید

"پہچانا مجھے؟ بھلا بتاؤ میں کون ہوں؟"

ٹیلی فون پر ایک نامانوس آواز اپنا نام بتانے کی بجائے مجھ سے پہیلیاں بجھوانا چاہتی تھی۔ میں نے اپنی معذوری کا اظہار کیا۔ مگر ٹیلی فون لائن کے دوسرے سرے پر کھڑے یا شاید بیٹھے ہوئے شخص کا اصرار بڑھتا چلا گیا۔ اسے اعتبار نہیں آ رہا تھا کہ کوئی شخص اس کی آواز کو بھول سکتا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ اسے اپنا تعارف خود کرا دینا چاہیئے، مگر وہ اس کے لئے تیار نہ تھا۔ اس نے کہا کہ مجھے پندرہ برس قبل کی طرف دھیان دینا چاہیئے۔ وہ نیا نیا پاکستان سے آیا تھا اور ہماری ملاقات سرراہے ہوئی تھی۔ میں نے کہا میرے ساتھ ایسا کئی بار ہو چکا ہے۔ مجھے نہ تو ان سب ملنے والوں کے نام یاد ہیں اور نہ ہی ان کی آوازیں میری یادداشت میں محفوظ ہیں۔ اس نے کہا کہ یہ بات ناممکن ہے کہ کوئی شخص اس کو بھلا دے۔ یہ چیز اس کے ساتھ کبھی پیش نہ آئی تھی۔ آخر زچ آ کر میں نے کہا کہ اگر وہ اپنا تعارف نہیں کراتا، تو مجھے مجبوراً فون بند کرنا پڑے گا، کیونکہ مجھے آخر دوسرے کام بھی کرنے ہیں۔

یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور اس نے اپنا نام سلیم بتایا۔ مگر میری یادداشت کے مخزن میں کوئی دیا نہ جلا۔ اس کی آواز اس سلیم سے بہت مختلف تھی، جس کے ساتھ میری ایک زمانے میں دوستی رہی تھی۔ میں نے اسے اپنے بارے میں کسی قدر تفصیل سے بتانے کو کہا۔ اس نے کہا کہ وہ وزیرآباد کا رہنے والا ہے اور ہمبرگ میں مہینہ بھر ٹھہرا تھا۔ پھر آگے لندن چلا گیا تھا، جہاں سے اس نے مجھے ایک کارڈ لکھا تھا، جس میں ایک جرمن لڑکی کے نام سلام بھیجا گیا تھا۔

"اچھا، تو تم ڈون خوان سلیم ہو، جو ہر لڑکی پر اپنا دل نچھاور کرتا پھرتا تھا"۔

میری باطنی آنکھوں کے سامنے ایک پستہ قد نوجوان کا نقشہ ابھرا، جو اپنے بالوں کو کریم لگا کر کھڑا کرنیکی کوشش کرتا تھا اور ہر آدھ پون گھنٹے کے بعد بالوں میں کنگھی کرتا تھا۔ یہ کاروائی اپنے قد کو بڑھانے کی خاطر کی جاتی تھی۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ جرمنی میں ایسے جوتے ملتے ہیں، جنکو پہننے سے آدمی کا قد تین چار انچ بڑھ جاتا ہے، البتہ انکی قیمت عام جوتوں سے کئی گنا ہوتی ہے۔ وہ اپنا قد بڑھانے کی خاطر ہر قیمت ادا کو تیار تھا، مگر اس زمانے میں بدقسمتی سے اسکی جیب اسکی اجازت نہ دیتی

تھی

" کیا تم نے قد بڑھانے والے جوتے خریدے تھے؟" میں نے اسے چھیڑا۔

"وہ بات تم کو اب تک یاد ہے"۔اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"مجھے صرف یہی بات یاد نہیں" میں نے ہنستے ہوئے کہا:" بلکہ تمہاری یہ خواہش بھی کہ فی الفور تمہارا تعارف کسی جرمن لڑکی کے ساتھ کرا دیا جائے۔جس پر میں نے کہا تھا کہ تمہیں ڈانسنگ ہال میں جا کر اپنی قسمت آزمانی چاہیئے "۔

سلیم کو ڈانس کرنا نہیں آتا تھا،مگر اس نے ڈانسنگ کے سین ہالی وڈ کی فلموں میں دیکھ رکھے تھے۔اس کا خیال تھا کہ ڈانس کرنے کے لئے اتنا کافی ہے کہ آدمی کولہوں کو دائیں بائیں گھمائے، بازوؤں کو ہوا میں لہرائے،سر کو اوپر نیچے جھٹکے اور ٹانگوں کو آگے پیچھے پھینکے اور گاہے بگاہے اچھلے کودے۔ میں نے کہا کہ یہ حرکات کسی تنظیم کے بغیر نہیں ہوتیں اور نہ ہی موسیقی کی بیٹ سے ہٹ کر کی جاتی ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ وہ یورپین موسیقی کا ایک عمر سے رسیا ہے،اس لئے اسے ڈانس کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے گی۔

مجھے ہمبرگ میں رہتے ہوئے ڈیڑھ سال ہو چلا تھا،مگر اس روز تک مجھے پتہ نہ تھا کہ اس شہر کے ڈانسنگ ہال کہاں پر پائے جاتے تھے۔میں نے اس وقت تک رسوائے زمانہ چکلہ ریپر باہن کی زیارت بھی نہ کی تھی،جس کے بارے میں سیاح سب سے پہلے پوچھتے تھے۔یہ ان دنوں کی بات ہے، جب بعد میں عالمی شہرت پانے والے بیٹلز کا گروپ ریپر باہن کے اسٹار کلب میں ہر شام کو موسیقی پروگرام کرتا تھا۔

میں نے اپنے واقف کاروں سے ڈانسنگ ہال کے بارے میں پوچھا،تو کسی نے کہا کہ اپنے دوست کو لبشر باؤم میں لے جاؤ۔جہاں پر ہر ویک اینڈ پر ڈانسنگ کا خاص پروگرام ہوتا ہے۔وہاں پر اس کو یقیناً کوئی نہ کوئی بیوہ مل جائے گی۔

اس زمانے میں جرمنی میں بیواؤں کی کثرت تھی، جنکے خاوند جنگ میں مارے گئے تھے یا روس کے جنگی کیمپوں میں اپنی زندگی کے باقی ماندہ دن گذار رہے تھے۔جرمنی میں اسوقت ایک مرد پر تین عورتیں آتی تھیں۔شادی شدہ مرد بھی دو چار عورتوں سے جنسی تعلقات رکھنے کو روا رکھتے تھے۔لبشر باؤم اس سلسلہ میں خاصہ بدنام تھا۔وہاں پر مردوں سے زیادہ عورتیں جاتی تھیں۔اس طرح لولے لنگڑے مردوں کو بھی وہاں پر رات بھر کیلئے کوئی نہ کوئی سہاگن ہاتھ لگ جاتی تھی۔

میں نے سلیم کو پتہ لکھ کر دیا، مگر وہ اکیلا جانے سے گھبراتا تھا، کیونکہ وہ سوائے بٹے شوین اور دانکے شوین کے دو لفظوں کے جرمن زبان سے ناواقف تھا۔ اس نے کہا کہ مجھے اسکے ساتھ بطور مترجم کے چلنا ہوگا۔ انسان اپنے دوستوں کی خاطر کیا کیا قربانیاں نہیں دیتا۔ میں نے تھوڑے لیت ولعل کے بعد اسکے ہمراہ چلنا منظور کر لیا اور دل میں سوچا کہ مجھے اس بارے میں معلومات ہونی چاہیئں۔ یہ کیا ہوا کہ انسان ایک معاشرے میں رہے اور اسکی تفریحی سرگرمیوں کے بارے میں کچھ نہ جانتا ہو اور کورے کا کورا رہے۔

اتوار کی سہ پہر کو ہم اپنے بہترین سوٹ پہن کر لبشر باؤم ڈانسنگ ہال میں جا دھمکے۔ وہاں پر دنیا جہان کے رواج کے برخلاف مردوں کو داخلے کا ٹکٹ نہیں خریدنا پڑتا تھا، کیونکہ عورتوں کے مقابلے میں انکی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہوتی تھی۔ عورتوں کو البتہ ٹکٹ لینا پڑتا تھا۔ ہال میں اکثر کرسیوں پر عورتوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ مرد اکیلے دکیلے تھے اور عورتیں انکو نظروں ہی نظروں میں جانچ تول رہی تھیں۔ ویٹر نے کہا کہ ہمیں الگ الگ میزوں پر بیٹھنا چاہیئے۔ مگر سلیم کا اصرار تھا کہ میں اسکے پہلو سے نہ سرکوں۔ آخر ہمیں ایک میز مل گیا، جس پر دو نوعمر لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ انکے ساتھ علیک سلیک ہوئی اور ہم ان سے اجازت لے کر اس میز کی دونوں خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اب مرحلہ مشروب چننے کا تھا۔ میں نے اپنے لئے سیب کا جوس چنا۔ سلیم نے وائن کا آرڈر دیا۔ لڑکیاں بیئر کے گلاس اپنی ناک تلے رکھے ہوئے بیٹھی تھیں۔

لڑکیوں کو تھوڑی بہت انگریزی آتی تھی، جو انہوں نے اسکول میں سیکھی تھی۔ مگر کتابی زبان سے شد بد ایک چیز ہے اور کسی کے ساتھ اس زبان میں گفتگو کرنا بالکل دوسری۔ ان کو انگریزی بولنے کی مشق نہیں تھی۔ اس لئے جو بات ان سے انگریزی میں ادا نہ ہو پاتی تھی، اسے وہ جرمن میں کہتی تھیں اور میں اس کا ترجمہ انگریزی میں کر دیتا تھا۔ اور اگر سلیم کی پاکستانی انگریزی اس کے سروں کے اوپر سے گذر جاتی تھی، تو میں ان کو جرمن میں اس کا مدعا سمجھا دیتا تھا۔

لڑکیوں کی عمریں اٹھارہ انیس کے لگ بھگ تھیں۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مردوں کے سلسلہ میں خاصی کوری تھیں۔ غیر ملکیوں کے ساتھ بات کرنے کا انہیں پہلی بار اتفاق ہو رہا تھا۔ پاکستان کا نام انہوں سن رکھا تھا۔ مگر نہیں جانتی تھیں کہ وہ ملک کرۂ عرض کے کس خطے میں پایا جاتا تھا۔ ہم نے ہندوستان کے حوالے سے بتانا چاہا، مگر ان کو اتنا بھی پتہ نہ تھا کہ برصغیر کی تقسیم ہو چکی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان میں گائے کی پوجا کی جاتی ہے اور سب لوگ مہاتما گاندھی کی طرح دو چادروں میں

لپٹے ہوئے آدھا دھڑ ننگا لئے ہوئے گھومتے پھرتے ہیں۔

سلیم کو دونوں لڑکیاں اچھی لگتی تھیں اور اس کا خیال تھا کہ وہ دونوں کو سنبھال سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کو اپنی بساط کو دیکھ کر بات کرنی چاہئیے۔ میری ترجمانی کے بغیر وہ نہ تو ان کی بات کو سمجھنے کے قابل ہے اور نہ خود اپنا مدعا ان تک پہنچا سکتا ہے۔ یوں بھی یہ بات لڑکیوں کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ ہمارے ساتھ دوستی چاہتی ہیں یا نہیں۔ سلیم کا گمان تھا کہ جب اس نے دوستی کا فیصلہ کر لیا ہے، تو سب کچھ طے پا گیا ہے۔ اب صرف یہ مرحلہ باقی تھا کہ ان کو ڈانسنگ ہال سے کسی حیلے کے ذریعہ باہر لایا جائے۔ اس زمانے میں ٹوسٹ ڈانس نیا نیا نکلا تھا اور کولہوں کو گھماتے گھماتے ہماری پسلیاں دکھنے لگی تھیں۔ لڑکیوں کا حال ہم سے بہتر نہ لگتا تھا۔ ان کو بھی شاید ٹوسٹ ڈانس ناچنے کا اس سے قبل اتفاق نہ ہوا تھا۔ اسلئے جب ہم نے ان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ کسی اطالوی ریستوران میں چل کر شام کا کھانا کھایا جائے، تو وہ فوراً ہمارا ساتھ دینے کیلئے تیار ہو گئیں۔

جب ہم ڈانسنگ ہال سے باہر نکلے، تو شام ہو رہی تھی۔ اس روز موسم اچھا تھا اور خلاف معمول بارش نہ ہوئی تھی۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے تھے۔ اگست کا آخری عشرہ تھا اور اگرچہ کلینڈر پر موسم گرما اختتام کو نہ پہنچا تھا، یوں لگتا تھا، جیسے خزاں کی آمد آمد تھی، کیونکہ درختوں کے پتے زردی پکڑنے لگے تھے۔ سلیم اس دوران میں کاتھرین کے حق میں فیصلہ دے چکا تھا اور اسکے پہلو بہ پہلو چل رہا تھا۔ مجھے اس بات پر کچھ حیرت سی ہوئی، کیونکہ کاتھرین اس سے کم و بیش بالشت بھر بڑی تھی اور جتنا سلیم موٹا تھا، اتنی ہی وہ دبلی پتلی تھی۔ سوزانے، جو میرے حصے میں آئی تھی، قد کاٹھ میں مجھ سے انگلی بھر چھوٹی تھی، مگر اپنی سہیلی کے برعکس صحت مندی کی تصویر تھی۔ پتہ چلا کہ دونوں اسکول میں کلاس فیلو رہ چکی تھیں اور ان دنوں ایک ہی فرم میں سیکرٹری تھیں۔ انکا خیال تھا کہ انگریزی بولنے کی مشق کرنے سے ان کی تنخواہ میں اضافہ ہو جائے گا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ ہمارا ساتھ اتنا لمبا ہو گا کہ انکی انگریزی بولنے کی استطاعت میں اضافہ ہو سکے گا۔ سلیم کے جرمنی میں رہ جانے کے امکانات نظر نہیں آتے تھے۔ وہ تین ہفتوں سے دوڑ دھوپ میں لگا ہوا تھا۔ اسکو موٹروں کے سپیئر پارٹس کی خرید و فروخت کا تجربہ تھا، مگر جرمن زبان نہ جاننے کی وجہ سے کوئی متعلقہ کمپنی اسکو ملازم رکھنے کیلئے تیار نہ ہو رہی تھی۔ اس وجہ سے وہ انگلستان جانے کیلئے پر تول رہا تھا۔ اس زمانے میں پاکستانیوں پر اس ملک میں داخلہ پر کوئی پابندی نہ تھی۔ بلکہ انکو یورپ کے کسی ملک کیلئے انٹری ویزا نہیں لینا پڑتا تھا۔

وہ شام کاتھرین اور سوزانے کے ساتھ مزے کی گذری۔ ریستوران سے کھانا کھانے کے

بعد ہم شہر کے بڑے پارک میں گھومتے پھرے۔ کچھ چوما چاٹی بھی ہوئی، مگر کسی نے حد سے آگے بڑھنے کی جرأت نہ کی۔ لڑکیوں کو ماں باپ کی طرف سے دس بجے تک گھر پہنچ جانے کی تاکید تھی۔ جس کی ہم نے فرمانبرداری سے پابندی کی اور لڑکیوں کو ان کے انڈر گراونڈ اسٹیشن تک چھوڑنے گئے۔ آپس میں ٹیلی فون کے نمبروں کا تبادلہ ہوا اور آخری بوسہ دے کر الوداع کہا گیا۔

ایک ہفتہ کے بعد سلیم انگلستان چلا گیا اور چونکہ یونیورسٹی گرمیوں کی تعطیلات کی وجہ سے بند تھی، اس لئے میں جنوبی یورپ کے تفریحی سفر پر روانہ ہو گیا۔ جب میں چار ہفتوں کے بعد سفر سے واپس لوٹا، تو سلیم کا کارڈ آیا ہوا تھا، جس میں لکھا تھا کہ اسے لندن کی ایک فرم میں اچھی جاب مل گئی تھی اور اس کی رہائش کا بھی خاطر خواہ انتظام ہو گیا تھا۔ کاتھرین کے نام اس نے سلام بھیجا تھا اور پیغام دیا تھا کہ اگر وہ پسند کرے، تو لندن میں اس کے پاس آ کر ٹھہر سکتی ہے۔ یہ پیغام میں نے اسی روز کاتھرین کو ٹیلی فون پر دے دیا اور سلیم کا پتہ بھی نوٹ کرا دیا۔

اسکے بعد میرا رابطہ کاتھرین اور سوزانے سے ٹوٹ گیا۔ میں تو انہیں سرے سے ہی بھلا بیٹھا تھا۔ پندرہ برسوں کے بعد سلیم کا فون آنے پر پھر ایک بار ان کے نام دھرائے گئے، تو ان کی یاد تازہ ہوئی اور میں یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ کیا کبھی کاتھرین اس کو ملنے کے لئے لندن آئی بھی تھی؟

"ضرور آئی تھی، بلکہ ہمارا رابطہ سارے سالوں کے درمیان متواتر قائم رہا تھا۔ اس وقت بھی جب اس نے ورنر سے اور میں نے کیرولین سے شادی کر لی تھی۔ ہم دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے محبت کے جذبات اتنے گہرے تھے کہ جب دونوں طرف کی شادیاں ناکام ہو گئیں، تو کاتھرین سال میں دو تین بار لندن میرے پاس آ کر ٹھہرنے لگی۔ پھر ہم نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک ماہ سے وہ میری بیاہتا بیوی ہے اور میرے پاس یہاں پر لندن میں رہتی ہے۔ میں تم کو یہی خبر دینے کے لئے فون کر رہا ہوں"۔

سلیم کی آواز میں فتح کی کھنک تھی، جیسے اس نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا معرکہ سر کر لیا ہو۔ مجھے یہ خبر دے کر شاید وہ یہ جتانا چاہتا تھا کہ وہ اپنی بات کا پکا ہے اور جو بات ایک بار کہہ دے اس پر قائم رہتا ہے۔ اس نے پندرہ برس ادھر مجھے کہا تھا کہ وہ کاتھرین سے شادی کرے گا۔ جس پر میں نے اس کا مذاق اڑایا تھا اور کہا تھا کہ پھر اسے ساری عمر قد بڑھانے والے جوتے پہننے پڑیں گے اور جب وہ کاتھرین کو چومنا چاہے گا، تو سیڑھی لگانی پڑے گی۔

اس گفتگو کے بعد برسوں تک اس کی طرف سے کوئی خبر نہ آئی۔ اور میں زندگی کے

دھندوں میں مصروف ہوکر اس کو پھر ایک بار بھلا بیٹھا۔ یہاں تک کہ میں آئندہ برسوں میں لندن جاتا آتا رہا، مگر کبھی سلیم سے ملنے کا خیال تک دل میں نہ آیا۔ دراصل میں نے سرے سے اس کا فون نمبر اپنی ایڈریس بک میں درج نہیں کیا تھا۔ پھر بھی اگر میں چاہتا تو یقیناً کسی ذریعے سے اس کا اتا پتا لگا سکتا تھا۔ دراصل ہماری واقفیت سرسری تھی اور ہمیں ایک دوسرے کی معیت میں بہت کم وقت گذارنے کا موقعہ ملا تھا، اس لئے ہمارے درمیان دوستی کا پودا جڑ نہیں پکڑ سکا تھا۔

جب پھر ایک بار دس بارہ برسوں کے بعد ایک روز مجھ سے کسی نے فون پر کہا: "پہچانا مجھے۔ بھلا بتاؤ میں کون ہوں؟" تو اگرچہ اس کی آواز مجھے اوپری لگی تھی، مجھے یقین تھا کہ لائن کے دوسری طرف سلیم ہوگا۔

"تم ڈون خوان سلیم ہو اور یقیناً مجھے کوئی نئی خبر دینی چاہتے ہو"۔

"خبر یہ ہے کہ میں پاکستان لوٹ رہا ہوں۔ میں نے اپنی کمپنی قائم کرلی ہے"

"بہت اچھی بات ہے۔ مگر یہ بتاؤ کہ کیا کاتھرین پاکستان جانے کو تیار ہے؟"

پتہ چلا کہ اس دوران میں ان کے دو بچے پیدا ہوئے تھے، جو آٹھ اور پانچ سال کے تھے اور انگلستان میں پڑھتے تھے۔ کاتھرین دوبار پاکستان جا چکی تھی اور سلیم کے گھریلو ماحول کو دیکھ چکی تھی۔ وہ کسی قیمت پر اس ملک میں جا کر رہنے کے لئے تیار نہ تھی۔ سلیم چاہتا تھا کہ میں کاتھرین سے بات کروں، کیونکہ وہ میرے بارے میں اچھی رائے رکھتی تھی۔ میں نے بہتیرا کہا کہ مجھے اس معاملے میں دخل اندازی اچھی نہیں لگتی، مگر سلیم کی ہٹ کے سامنے میری ایک نہ چلی۔

کاتھرین نے چھوٹتے ہی کہا کہ وہ پاکستان میں سلیم کے خاندان کے جائنٹ فیملی سسٹم کو دیکھ چکی ہے اور نہیں چاہتی کہ وہاں پر ساس، سسر، سلیم کے بھائیوں، ان کی بیویوں اور بچوں کے ساتھ ایک مکان میں جا کر رہے، جہاں پر ساس اور بڑی نند کا حکم چلتا ہے۔ اس مکان میں اتنے بڑے کنبہ کے لئے رہائش کی گنجائش موجود نہیں ہے۔ ہر بھائی کے پاس لے دے کے ایک کمرہ ہے۔ اس مکان میں ایک خاندان نہیں پورا گاؤں رہتا ہے"۔

"تمہاری بات درست ہے"۔ میں نے کہا: "لیکن اگر سلیم تمہارے لئے الگ مکان کا انتظام کرلے، تو کیا اس صورت میں تم جانے کو تیار ہوگی؟"

"مجھے تب بھی اعتراض ہوگا، کیونکہ یہاں پر انگلستان میں میرے بچے اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ وہ یورپین ماحول کے جمے پلے ہیں۔ پاکستان میں انکا واسطہ ایک مختلف ثقافت سے پڑے گا، جو

بہت حد تک یورپین ثقافت کی ضد ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہ تجربہ کامیاب نہیں ہوسکتا"۔

میں نے سلیم کو مشورہ دیا کہ کاتھرین اور بچوں کو انگلستان میں رہنے دے اور خود آتا جاتا رہے ۔ یوں بھی اس کی فرم کا کام امپورٹ ایکسپورٹ کا تھا اور سارا کاروبار یورپین فرموں کے ساتھ چلتا تھا۔ جس کے سبب سلیم کو آئے دن یورپ آنا پڑتا تھا۔ ہماری گفتگو کے خاتمے تک اس بات پر اتفاق ہوگیا اور کاتھرین نے چین کا سانس لیا۔ اس نے کہا کہ میری مداخلت کے بغیر یہ معاملہ طے ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔

اگلے دو برسوں کے دوران مجھے سلیم اور کاتھرین کی طرف سے کوئی خبر نہ ملی اور میں نے گمان کرلیا کہ سب ٹھیک ٹھاک ہوگا۔ پھر ایک روز سلیم کا فون فرانکفورٹ کے ہوائی اڈے سے آیا، جہاں پر اسکا جہاز پاکستان جاتے ہوئے تھوڑے وقفے کیلئے اترا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ بچوں کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا کاتھرین بھی انکے ساتھ ہے اور اگر نہیں تو کیا وہ بچوں کو اسکی رضامندی سے لے جا رہا ہے؟

" کاتھرین نے مجھ سے علیحدگی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اسے ابھی پتہ نہیں ہے کہ میں بچوں کو پاکستان لے جا رہا ہوں"۔ سلیم نے جواب دیا۔

"بچوں کو انگلستان سے تم باہر کیسے لا سکے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"دونوں بچے میرے پاکستانی پاسپورٹ میں درج ہیں۔ میں ان کو کاتھرین کی اجازت سے سیر سپاٹے کے لئے گھر سے لایا تھا۔ وہاں سے ہم سیدھے ہوائی اڈے پر پہنچے، جہاں پر پاکستان جانے والا طیارہ پرواز کے لئے تیار کھڑا تھا۔ میں نے بچوں کے لئے پہلے سے ٹکٹ خرید رکھے تھے"۔

" گویا تم بچوں کو اغوا کر کے لے جا رہے ہو۔ کیا تمہیں پتہ نہیں ہے کہ یہ چیز قانون کی نظر میں ایک قابل سزا جرم ہے؟" مجھے اس چیز پر سخت افسوس ہو رہا تھا اور اگر وہ کہیں آس پاس ہوتا، تو میں اسے روکنے کے لئے خود پہنچ جاتا۔

"میں کسی جرم کا ارتکاب نہیں کر رہا۔ صرف اپنے بچوں کو اپنے ملک لے جا رہا ہوں، جہاں پر میری مستقل رہائش ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کاتھرین کو فون کر کے بتا دو کہ میں بچوں کو ساتھ لے جا رہا ہوں، تاکہ وہ پریشان نہ ہوتی پھرے۔ بچے اپنی رضامندی سے میرے ساتھ جا رہے ہیں"۔

" مجھے یقین نہیں ہے کہ بچے اپنی مرضی سے جا رہے ہیں۔ اور اگر میں اس وقت کاتھرین کو فون کر کے بتا بھی دوں، تو وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ میرے نزدیک یہ نہایت رذیل حرکت ہے، جس میں اب تم مجھے ملوث کرنا چاہتے ہو۔ میں کاتھرین کو فون نہیں کروں گا"۔ میں نے جواب دیا اور فون رکھ دیا۔

تھوڑے دنوں کے بعد کاتھرین کا فون آ گیا۔اس نے سلیم کے خلاف بچوں کے اغوا کا کیس کر دیا تھا۔اس وجہ سے اگر سلیم کبھی انگلستان آیا،تو گرفتار کرلیا جائے گا۔کاتھرین جانتی تھی کہ وہ بچوں کو قانونی طور پر پاکستان سے نہیں نکلوا سکتی، کیونکہ وہ اس ملک کے نیشنل تھے۔اس وجہ سے اس کا خیال تھا کہ اگر میں اس کے ساتھ پاکستان چلوں،تو شاید سلیم بچوں کو انگلستان جانے کی اجازت دے دے۔

"میں سلیم کیلئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور ہماری دوستی بھی اتنی گہری نہیں ہے کہ میں اس معاملہ میں دخل اندازی کا مجاز ہوں"۔میں نے جواب دیا۔

کاتھرین نے کہا کہ وہ اس صورت میں اپنے بھائی کو ساتھ لے جائے گی اور سلیم کو منوانے کی کوشش کرے گی۔وہ سلیم کے خلاف اغوا کا کیس واپس لینے کے لئے تیار تھی اور طلاق کی کاروائی کو بھی روکنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

"میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔مگر کامیابی کی امید نہیں ہے"

اس کے بعد تین چار برسوں تک مجھے کوئی خبر نہ ملی کہ سلیم اور کاتھرین نے اس مسئلے کو کیسے سلجھایا تھا۔یہاں تک کہ پھر ایک بار سلیم نے کسی ائرپورٹ سے فون کیا اور بتایا کہ کاتھرین اس کے ساتھ لاہور میں رہ رہی ہے۔

" کیا وہ اپنی مرضی سے رہ رہی ہے؟"میں نے پوچھا۔

"تم بھی عجیب باتیں کرتے ہو۔ماں تو وہیں پر رہے گی، جہاں پر اسکے بچے رہتے ہیں"۔سلیم کی آواز میں اپنی فتح کی کھنک صاف سنائی دے رہی تھی۔"تم اپنے اگلے سفر پاکستان کے دوران لاہور میں خود کاتھرین سے پوچھ کر تسلی کر لینا کہ وہ اپنی مرضی سے وہاں پر رہ رہی ہے"۔

میں نے اسی وقت دل میں طے کرلیا کہ اس معاملے کی تہہ تک پہنچوں گا۔چنانچہ جب چند ماہ کے بعد میرا پاکستان جانا ہوا،تو میں ملنے کے لئے ان کے گھر گیا۔کاتھرین نے میرا استقبال گرم جوشی سے کیا۔ہمیں آخری بار ملے ہوئے ایک عمر بیت چکی تھی اور اس قدر بدل چکے تھے کہ اگر ہمارا آمنا سامنا سڑک پر ہوتا،تو ایک دوسرے کو نہ پہچان سکتے۔اتفاق سے سلیم ان دنوں یورپ کے سفر پر تھا۔اس طرح مجھے کاتھرین کے ساتھ علیحدگی میں بات کرنے کا موقعہ مل گیا۔

" کیا یہ سچ ہے کہ تم اپنی مرضی سے یہاں پر رہ رہی ہو؟"میں نے پوچھا۔

"اپنی مرضی سے یہاں پر رہنے کی بات تم سے یقیناً سلیم نے کی ہوگی۔حقیقت اس سے بہت مختلف ہے۔جب تم میرے ساتھ لاہور آنے کیلئے تیار نہ ہوئے تو میں اپنے بھائی کو لیکر یہاں پر آئی

تھی۔ سلیم کی غیر حاضری میں اسکے رشتہ داروں نے بچوں کو گھر کے پچھلے دروازے سے نکال کر اپنے گاؤں میں پہنچا دیا۔ میں پندرہ روز تک یہاں پر سلیم کی واپسی کا انتظار کرتی رہی۔ پھر مامتا کی ماری یہیں پر رہ گئی۔ سلیم نے میرا اور بچوں کا پاسپورٹ لیکر اپنی فرم کے سیف میں بند کر رکھا ہے۔ مجھے دونوں بچوں کے ساتھ اکیلے سفر نہیں کرنے دیتا۔ اسلام آباد جانا ہو، تو میں صرف ایک بچے کو لے جا سکتی ہوں۔ دوسرے کو یرغمال بنا کر لاہور میں رکھا جاتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں بچوں کی خاطر جلاوطنی کی قید جھیل رہی ہوں، جس کو سلیم میرا اپنی مرضی سے یہاں پر رہنا کہتا ہے"۔

(کمرفیلڈ۔ ۱۹ اگست ۲۰۰۰ء)

رچرڈ رائٹ

کیرول کی گاڑی لیٹ تھی۔اس طرح مجھے کروئیڈن ریلوے اسٹیشن کے گردونواح پر ایک نظر ڈالنے کا وقت مل گیا۔ میں ایک لمبے وقفے کے بعد انگلستان آیا تھا، جہاں پر پہنچ کر مجھے ہمیشہ یوں لگتا ہے، جیسے میں کسی جانے پہچانے شہر میں آ گیا ہوں۔ وہی مانوس آوازیں، لیفٹ ہینڈ ٹریفک، مردوں کی لباس کے معاملے میں ایک گونا لاپرواہی، عورتوں کے پاوڈر سے لپے پتے ہوئے چہرے، شہر کی مانوس بو باس۔ یہ ساری چیزیں میں راولپنڈی میں گذرے ہوئے بچپن کے زمانے سے جانتا ہوں، جو برٹش انڈیا میں ناردرن کمانڈ کا ہیڈ کوارٹر ہوا کرتا تھا، جس کے سبب صدر کے علاقے میں انگریزوں کی اچھی خاصی آبادی تھی۔

میرا اسکول عین اس سرحد پر واقع تھا، جہاں سے آگے صدر کا علاقہ شروع ہوتا تھا، جس کے ساتھ ہندوستانی آبادی کا کم ہی سروکار تھا۔ کبھی کبھار میں اپنے سنگی ساتھیوں کے ہمراہ گھومنے پھرنے کے لئے میسی گیٹ چلا جاتا تھا۔ وہاں پر انگریز میمیں اپنے مردوں کی باہوں میں باہیں ڈالے مٹرگشت کر رہی ہوتی تھیں۔ ان کی ننگی پنڈلیاں، آدھی باہوں والے بلاوزر، کٹے ہوئے بال اور لب اسٹک سے رنگے ہوئے سرخ ہونٹ دیکھ کر راولپنڈی پر انگلستان کے کسی متوسط درجہ کے شہر کا گمان ہوتا تھا، جس کے بارے میں ہم نے اپنی انگلش ریڈر میں پڑھ رکھا تھا۔ یہ بات ہندوستان کی آزادی سے قبل کی ہے، جب ہمارے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ برٹش انڈیا کے دن گنے چنے ہیں۔

پھر جیسے چڑیاں پھر سے اڑ جاتی ہیں، اس طرح ایک روز انگریز غائب ہو گئے تھے۔ صرف اکا دکا باقی رہ گئے تھے، جو ڈار سے بچھڑ جانے والے پرندوں کی طرح گواچے ہوئے لگتے تھے۔ یہ لوگ شاید کم حیثیت رکھنے والے تھے، کیونکہ وہ اکثر بائیسکلوں پر سوار گھومتے پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ ان کے پاس کاریں نہیں تھیں اور نہ ہی ان کی رہائش بنگلوں میں تھی۔ ان کو دیکھ کر ہم آپس میں چہ میگوئیاں کیا کرتے تھے کہ ان کا انگلستان میں شاید کوئی والی وارث نہیں ہے، وگرنہ وہ اپنے وطن واپس لوٹ گئے ہوتے، جس کے بارے میں ہم اس خوش فہمی کا شکار تھے کہ وہاں پر دولت کی ریل پیل ہوگی اور ہر شخص مزے کی زندگی گذارتا ہوگا۔

مجھے خوب یاد ہے کہ ایک اتوار کی دوپہر کو ایک سائیکل سوار انگریز اباجی کی معیت میں

ہمارے گھر آیا تھا۔ دونوں آپس میں انگریزی بول رہے تھے، مگر مجھ سے اس نے اردو میں بات کی تھی۔ اس کا تلفظ تھوڑا نامانوس تھا، مگر وہ سہولت کے ساتھ اردو بول رہا تھا۔ اس کی اردو بہرصورت میری انگریزی سے بہتر تھی، جس کی اس نے خدا جانے کیوں تعریف کی تھی اور کہا تھا:

"اٹنا چوٹا بچا اٹنی اچھی انگریزی بولتا ہے"۔

دوپہر کا کھانا اس نے ہمارے ہاں کھایا تھا۔ بلکہ اس کے بعد یہ معمول بن گیا اور وہ ہر اتوار کو ہمارے ہاں دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے آنے لگا۔ ابا جی نے بتایا کہ وہ مسلمان بننا چاہتا ہے اور پاکستانی شہریت حاصل کرنے کا خواہشمند ہے۔ ابا جی کے ساتھ اسکا ملنا کسی دفتری کام کے سلسلہ میں ہوا تھا۔ باتوں باتوں میں اس کی اسلام میں دلچسپی کا پتہ چلا، تو ابا جی کی تبلیغی رگ پھڑک اٹھی۔ انہوں نے کہا کہ اگر وہ پسند کرے، تو وہ ہر اتوار کو اس کے لئے تین چار گھنٹے نکالنے کے لئے تیار ہیں۔ پھر یہ طے پایا کہ وہ دوپہر کا کھانا ہمارے ہاں کھایا کرے گا۔ یہ سلسلہ دو برسوں تک جاری رہا اور اس میں شاید ہی کبھی ناغہ ہوتا تھا۔

میں اپنے لڑکپن کی یادوں میں کھویا ہوا کھڑا تھا، جب کسی نے مجھے پیچھے سے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ کیرول نے وہی عطر لگا رکھا تھا، جسے میں ایک عمر سے جانتا اور پسند کرتا تھا۔ بلکہ میں نے ہی وہ عطر کیرول کو پہلی بار اسکی سالگرہ پر تحفے میں دیا تھا۔

کیرول کے ساتھ میری ملاقات ہمبرگ یونیورسٹی کے پہلے سمسٹر میں ہوئی تھی۔ وہ جرمن زبان میں مہارت پیدا کرنے کے لئے لندن سے آئی ہوئی تھی، جہاں پر وہ یونیورسٹی آف لندن میں جرمن اور فرانسیسی پڑھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ میری ملاقات کا سبب مغربی برلن کا سفر بنا تھا، جس کا انتظام جرمن حکومت کے محکمہ اطلاعات کی طرف سے کیا جاتا تھا۔ اس سفر کا مقصد یہ تھا کہ طالب علموں کو دکھایا جائے کہ جمہوریت میں انسان کو کس قدر آزادی میسر ہے اور اس کے مقابلے میں مشرقی جرمنی کی اشتراکی حکومت کیسے انسانوں کو جکڑ کر رکھتی ہے۔ طالب علموں کو اس سیاسی پروپیگنڈے سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ان کے لئے بس اتنا کافی تھا کہ ان کو ایک ہفتہ مفت میں برلن کی سیر کرائی جاتی تھی، جس کے دوران ان کو اونچے درجے کے ہوٹلوں میں ٹھہرایا جاتا تھا، اچھا کھانا کھلایا جاتا تھا، تھیٹر اور اوپیرا کے شوز دکھائے جاتے تھے۔ اس لئے اگر ایک آدھ لیکچر جمہوریت کی افادیت پر بھی سننا پڑے، تو بھلا کیا حرج ہے۔

مغربی برلن کی راتیں اس زمانے میں لمبی ہوتی تھیں، جنکو طالب علم ڈانسنگ باروں میں

گذارتے تھے۔ میری اس وقت تک کسی لڑکی کے ساتھ دوستی نہ رہی تھی۔ اسلئے میں نہ تو لڑکیوں کے چونچلوں سے واقف تھا اور نہ ہی مجھے پتہ تھا کہ فلرٹنگ کیسے کی جاتی ہے۔ شاید یہی میری ناتجربہ کاری کیرول کو بھا گئی تھی اور اس نے میرا قرب تلاش کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے تھیٹر میں جانے کی بجائے موسیقی کے پروگرام کا انتخاب کیا، تو وہ بھی اسی گروپ میں شامل ہوگئی۔ دوسرے روز میں نے آرٹ گیلری پر قدیمی مصری تہذیب کے میوزیم کو ترجیح دی، تو وہ میرے پہلو بہ پہلو چلنے لگی۔ تیسرے روز تک مجھے یقین ہو چکا تھا کہ ہماری پسند ایک جیسی ہے اور کیرول مجھے اچھی لگنے لگی۔

ہمارے گروپ میں انگریز لڑکے لڑکیوں کا ٹولہ چھ افراد پر مشتمل تھا، جو دوسروں سے گردے کی بوٹی کی طرح الگ تھلگ رہتا تھا۔ یہ لوگ اکثر وقت آپس میں انگریزی بولتے تھے، جب کہ دوسرے غیر ملکی اپنی ٹوٹی پھوٹی جرمن سے کام چلاتے تھے۔ کیرول کی وجہ سے میں انگریزی ٹولے کا حصہ بن گیا۔ یہ لوگ چونکہ برطانیہ کے مختلف حصوں سے آئے تھے اور اپنے اپنے علاقے کا لہجہ بولتے تھے یا کم سے کم اپنے ہاں بولا جانے والا تلفظ استعمال کرتے تھے، اس لئے میرے لئے ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا انگریزی سیکھنے کی حد تک خاصا نفع بخش ثابت ہوا۔

ہمبرگ واپس لوٹنے کے بعد میرا بہت سا وقت کیرول کے ساتھ گذرنے لگا، جو یونیورسٹی کے قریب مقیم تھی۔ البتہ میری رہائش اس زمانے میں ہمبرگ کے بے حد پھیلے ہوئے شہر کے دور ترین علاقے میں تھی، جہاں سے یونیورسٹی آنے جانے کا ایک طرف کا سفر کم وبیش ڈیڑھ گھنٹے کا تھا۔ میری لینڈ لیڈی سیگی اور اس کے خاوند ہربرٹ نے اپنے بیٹے کے امریکہ چلے جانے کے بعد سوچا کہ والٹر کا کمرہ کرائے پر چڑھا دیا جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ کوئی غیر ملکی طالب علم ان کے پاس آ کر رہے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح گھر میں تھوڑی بہت رونق لگی رہے گی۔ وگرنہ کرایہ کی رقم اتنی معمولی تھی کہ اس سے زائد آمدنی پیدا کرنے کی بات نہیں کی جا سکتی۔

چونکہ ان کا مکان یونیورسٹی سے بہت دور شہر کے بیرونی علاقے میں واقع تھا، اس لئے انہیں امید نہیں تھی کہ کسی طالب علم کو وہاں پر آ کر رہنے میں دلچسپی ہوگی۔ مگر اعلان چھپنے والے روز ہی ایک تیونسی طالب علم کا فون آ گیا، جسے فوری طور پر کمرہ درکار تھا۔ جب اس کو ہر روز اتنا لمبا سفر کر کے شہر جانا پڑا، تو اس نے دو ہفتوں میں ہتھیار ڈال دیئے۔ میری ملاقات اس تیونسی کے ساتھ یونیورسٹی کے کیفے ٹریا میں ہوئی۔ اس نے اپنے کسی عرب واقف کار کی معرفت دوسرا ٹھکانہ ڈھونڈ لیا تھا اور اپنا کمرہ کھٹی بیئر کی طرح کسی مستحق کو دینا چاہتا تھا۔ میں نے کہا کہ مجھے کمرہ چاہیئے خواہ وہ سائبیر یا میں ہی کیوں نہ ہو۔ میں

سڑک پر تو نہیں پڑا تھا، مگر اپنے سابقہ مکان سے ہر قیمت پر نکل جانا چاہتا تھا، کیونکہ میرے تعلقات لینڈ لارڈ کے ساتھ نقطہء انجماد پر پہنچ چکے تھے۔ تیونسی نے مجھے ہربرٹ کا فون نمبر دیا اور کہا:

"اسے کہہ دینا کہ مجھے اپنے ملک واپس لوٹنا پڑ گیا ہے۔ اس لئے میں تمہیں اپنی جگہ پر بھیج رہا ہوں"۔

میں نے ہربرٹ کو فون پر یہ بات بتائی اور پوچھا کہ کیا مجھے اس کے مکان میں کمرہ مل سکتا ہے۔ اس نے مجھے کمرہ دیکھنے کے لئے بلایا۔ یقیناً وہ اور اس کی بیوی مجھے دیکھنا چاہتے تھے۔ مجھے راستہ بہت لمبا لگا۔ مگر میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ہربرٹ کے پاس قطعہ زمین تو اچھا خاصا تھا، مگر مکان بہت مختصر تھا۔ سیگی نے خاص طور پر کافی تیار کر رکھی تھی، جس کے ساتھ کیک بھی کھانے کو دیا گیا۔ مجھے کمرہ پسند آیا اور ہربرٹ نے اس کے لئے جو کرایہ مانگا، وہ بھی مناسب تھا۔ میں نے پوچھا کہ کیا میں اسی روز منتقل ہوسکتا ہوں۔ انہیں اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ ہربرٹ نے کہا کہ مجھے اس مہینے کا کرایہ نہیں دینا پڑے گا، کیونکہ تیونسی پورے مہینے کا کرایہ ادا کر چکا تھا۔ ہربرٹ نے مکان کی ایک چابی میرے حوالے کی اور کہا کہ میں جب چاہوں سامان لے کر آ سکتا ہوں۔

مجھے ہمبرگ واپس جانے اور سامان لے کر لوٹنے میں آدھا دن لگ گیا۔ جب میں ہربرٹ کے مکان پر پہنچا، تو رات ہو چکی تھی۔ گھر پر کوئی نہیں تھا۔ ہربرٹ نے بتایا تھا کہ وہ اور سیگی شام کو اپنے دوستوں کے گھر تاش کھیلنے جائیں گے اور آدھی رات کے بعد واپس لوٹیں گے۔ گھر کی چابی میرے پاس تھی، مگر دروازے کے پیچھے ان کا شیفر کتا جیکی کھڑا غرا رہا تھا۔ جب میں پہلی بار اس گھر میں آیا تھا، تو کتا اس کمرے میں موجود تھا، جس میں میرا استقبال کیا گیا تھا۔ مگر مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ مجھے مالکان مکان کی غیر موجودگی میں گھر میں داخل ہونے دے گا۔ کتوں سے مجھے ہمیشہ سے ڈر لگتا آیا ہے۔ اس کا سبب ہمارے گاؤں کے کتے تھے، جن کے ساتھ میرا بچپن میں واسطہ پڑا تھا۔ چونکہ ہم بھائی بہن سال دو سال کے بعد چھٹیوں میں گاؤں جاتے تھے اور کتے ہمارے لئے اور ہم کتوں کے لئے اجنبی ہوتے تھے، اس لئے ہم اندھیرا پڑنے کے بعد کتوں سے ڈر کے مارے گھر سے باہر نہ نکلتے تھے۔ وہ کتے یوں بھی ایسے وحشی تھے کہ ہر آنے جانے والے پر لپک پڑتے تھے۔ اس زمانے میں مجھے یورپ کے کتوں کا کچھ ایسا تجربہ بھی نہ تھا، جن کو خاص تربیت دی جاتی ہے۔ میں ہمت کر کے دروازے پر جاتا تھا اور جیکی کو نام لے کر پچکارتا تھا۔ مگر جواب میں اس کی غضبناک غراہٹ کو سن کر پچھلے پاؤں بھاگنا پڑتا تھا۔ تو کیا مجھے ساری رات دروازے پر کھڑا رہنا پڑے گا؟ ہمسائے میں دو مکان پائے جاتے تھے، مگر وہاں پر کوئی پتی

نہیں جل رہی تھی۔ پھر بھی میں نے اس امید میں جا کر باری باری دونوں مکانوں کی گھنٹی بجائی کہ شاید وہ میری مدد کر سکیں گے۔ مگر وہ لوگ گھر پر نہیں تھے۔ گھنٹہ بھر سڑک پر کھڑا رہنے کے بعد میں نے ایک تجربہ کرنے کا ارادہ کیا۔ میرا منصوبہ یہ تھا کہ میں تالا کھولنے کے بعد دروازے کی ہتھی کو مضبوطی سے پکڑے رکھوں گا اور جیکی کا ردعمل دیکھوں گا۔ اگر وہ مجھ پر حملہ آور ہوا، تو میں دروازے کو کھینچ کر بھیڑ دوں گا۔ وگرنہ اس کو پچکارتا ہوا اندر داخل ہو جاؤں گا۔ یہ اسکیم کارگر ثابت ہوئی۔ دروازہ کھلنے پر میں نے دیکھا کہ جیکی نے مجھے پہچان لیا تھا اور بجائے مجھ پر حملہ کرنے کے وہ ڈیوڑھی میں سیگی کے جوتوں کو لئے بیٹھا تھا۔ وہ بیچارہ سیگی کی جدائی پر غم زدہ تھا۔ اس نے میرے مکان میں داخل ہونے کا ذرہ بھر نوٹس نہ لیا۔ میری جان میں جان آئی اور میں اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔ اگلی صبح میں نے سیگی اور ہربرٹ کو رات کا ماجرا سنایا، تو وہ بہت ہنسے۔ انہیں یہ بات بالکل نہ سوجھی تھی کہ میں جیکی سے ڈر کے مارے گھنٹہ بھر سڑک پر کھڑا رہوں گا۔

میں اس زمانے میں ابھی جرمن زبان سیکھ رہا تھا، جس کی کلاسیں شام کو لگتی تھیں۔ دن بھر کارخانے میں مزدوری کرنے کے بعد شام کو میں وہاں سے سیدھا یونیورسٹی چلا جاتا تھا، جہاں پر مینزا میں کھانا کھا کر مجھے کلاس اٹنڈ کرنی ہوتی تھی۔ دس بجے کے لگ بھگ وہاں سے فارغ ہو کر میں انڈر گراونڈ ریل میں گھر کے لئے روانہ ہو جاتا تھا۔ ریل گاڑی کے آخری اسٹیشن سے مجھے بس لینی ہوتی تھی، جو ایک ایک گھنٹے کے وقفے سے چلتی تھی۔ جب میں گھر پہنچتا تھا، تو اکثر رات کے بارہ بج چکے ہوتے تھے۔ ہربرٹ اور سیگی سو رہے ہوتے تھے اور صرف جیکی میرا استقبال کرتا تھا۔ مگر اب وہ مجھ پر نہیں بھونکتا تھا۔ اس نے مجھے گھر کے ایک فرد کے طور پر تسلیم کر لیا تھا۔ میں اپنے کمرے میں جا کر سو جاتا تھا۔ اگلی صبح ہربرٹ شیو کرنے اور نہانے دھونے کے بعد مجھے جگا دیتا تھا۔ مکان میں باتھ روم ایک ہی تھا۔ اس لئے ہم اسے باری باری استعمال کرتے تھے۔ جب میں باتھ روم سے فارغ ہو کر نکلتا تھا، تو سیگی نے میری چائے کا پانی ابال رکھا ہوتا تھا۔ میں کھڑے کھڑے ناشتہ کرتا تھا اور اکثر لیٹ ہونے کی وجہ سے مجھے بس اسٹینڈ تک کا فاصلہ دوڑتے ہوئے طے کرنا پڑتا تھا۔ سنیچر کے روز اس پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی آ جاتی تھی، کیونکہ مجھے کام پر نہیں جانا ہوتا تھا اور نہ ہی اس روز یونیورسٹی کی کلاسیں لگتی تھیں۔ ہربرٹ مجھے نو دس بجے جگاتا تھا اور میں ناشتہ کرنے کے بعد شہر چلا جاتا تھا، جہاں پر گھومنے پھرنے کے بعد مجھے مینزا میں اپنے دوستوں سے ملنا ہوتا تھا۔ ہفتے میں بس یہی ایک شام ہوتی تھی، جب میں دوستوں کے ساتھ سینما دیکھنے جاتا تھا۔ اس زمانے میں یونیورسٹی کے علاقے میں ایک سینما ہاؤس پایا جاتا تھا، جس کی ہر سیٹ کا

ٹکٹ ایک مارک میں ملتا تھا۔ وہاں پر اکثر پرانی فلمیں لگتی تھیں، مگر میرے لئے وہ نئی ہوتی تھیں، کیونکہ میں نے اپنے پہلے جنم میں کبھی کوئی فلم نہ دیکھی تھی۔

اس زمانے میں میرے دوستوں میں کوئی لڑکی نہ پائی جاتی تھی۔ ہربرٹ کہا کرتا تھا کہ تمہاری کولہو کے بیل جیسی زندگی میں کسی لڑکی کے لئے گنجائش بھی تو نہیں ہے۔ پھر جب میں برلن کے سفر سے واپس لوٹا اور گاہے بگاہے کیرول کے فون آنے لگے، تو ہربرٹ کے کان کھڑے ہوئے۔ اس نے کہا:

"معلوم ہوتا ہے تم نے برلن کے سفر کے دوران کسی انگریز لڑکی کا دل جیتا ہے۔ اس کو کسی اتوار کے روز یہاں پر لاؤ، تاکہ ہم بھی تمہاری پسند کی داد دے سکیں"۔

شاید وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میں کہیں غلط ہاتھوں میں تو نہیں پھنس گیا۔ سفر سے واپسی کے بعد میں ہفتہ اور اتوار کو سویرے سویرے گھر سے نکل جاتا تھا اور کہیں آدھی رات کو لوٹتا تھا، جب کہ اس سے قبل میں اتوار کے روز دوپہر تک سویا رہتا تھا اور چونکہ آس پاس کوئی ریستوران نہ پایا جاتا تھا، اس لئے پنیر کے ساتھ روٹی کھا کر اور چائے پی کر صبر شکر کر لیتا تھا۔ سیگی کو یہ چیز اچھی نہ لگی اور اس نے کہا:

"ایک نوجوان آدمی کو ہفتہ میں دو تین بار پیٹ بھر کر گوشت کھانا چاہیئے"

پھر اس نے خود ہی فیصلہ کیا کہ وہ ہر اتوار کو مرغ پکا کر مجھے کھانے میں شریک کیا کرے گی۔ یہ سلسلہ میرے برلن کے سفر تک چلتا رہا۔ مگر وہاں سے واپسی پر اس میں یہ تبدیلی آ گئی کہ میں سویرے سویرے کیرول سے ملنے کے لئے نکل جاتا تھا اور سارا دن اس کی معیت میں باہر گذار دیتا تھا۔

جون کا پورا مہینہ اور جولائی کا پہلا عشرہ کسی خواب کی طرح گذرے۔ ہم نے ہمبرگ اور اس کے گرد و نواح کے قابل زیارت مقامات کی جی بھر کر سیر کی۔ چونکہ ہم دونوں محبت کے میدان میں نئے نئے وارد ہوئے تھے، اس لئے اپنی جر□ت سے خود دبتے تھے اور ایک دوسرے کا ہاتھ تھامنے، چومنے اور گاہے گاہے بغل گیر ہونے سے آگے بڑھنے سے ڈرتے تھے۔

سمسٹر ختم ہو رہا تھا اور کیرول کے انگلستان واپس جانے کی تاریخ قریب تر آ رہی تھی۔ حسن اتفاق سے انہی دنوں میں میری نظر سے نوٹس بورڈ پر ایک اعلان گذرا، جس میں انگلستان میں وسط جولائی سے وسط اگست تک منعقد ہونے والے ایک بین الاقوامی سمینار میں شمولیت کے لئے درخواستیں بھیجنے کی دعوت تھی۔ میرے خط کا جواب چند روز کے اندر آ گیا اور مجھے انٹرویو کے لئے بلا لیا گیا۔ جرمنی کے لئے تین سیٹیں رکھی گئی تھیں، جن میں سے ایک میرے حصے میں آئی۔ اس کا مطلب تھا کہ انگلستان کے سفر پر کیرول کا ساتھ رہے گا۔ اس نے مجھے اپنے شہر گلوسٹر چلنے کی دعوت دی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اس کے ماں

باپ سے ملوں، تا کہ میں ان کے بارے میں اور وہ میرے بارے میں خود رائے قائم کر سکیں۔

اس زمانے میں تعطیلات کے دنوں میں طالب علموں کے لئے اسپیشل ٹرینیں چلتی تھیں، جن کا کرایہ رعایتی ہوتا تھا۔ ہم نے بھی ایک ایسی ٹرین میں سفر کرنے کا پروگرام بنایا، جو ہک فان ہالینڈ سے ایک فیری بوٹ میں چلی جاتی تھی۔ فیری نے ہمیں اگلی صبح انگلستان کے ساحلی مقام ڈوور پر پہنچا دیا۔ وہاں سے ٹرین لندن کے وکٹوریا اسٹیشن تک جاتی تھی۔ جب ہم لندن پہنچے، تو کیرول کے شہر جانے والی بس چلنے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ میں نے چار روز تک لندن میں قیام کے بعد بولٹن جاتے ہوئے راستے میں ایک رات کے لئے کیرول کے ماں باپ کے ہاں ٹھہرنے کا پروگرام بنایا۔

ان کا گھر ویسا ہی تھا، جیسے قطار وار بنے ہوئے لاکھوں دوسرے گھر، جن کے باسی اپنے گھر کو دوسروں کے گھروں سے ممتاز کرنے کیلئے اپنے دروازے پر اپنی پسند کا رنگ و روغن کر دیتے ہیں۔ کیرول کی ماں نے میرا استقبال خندہ پیشانی کے ساتھ کیا۔ کیرول کے باپ نے کھانے کے دوران مجھے انگلستان کے معاشرے کی کلاسوں میں تقسیم پر اچھا خاصا لیکچر دیا۔ وہ خود ٹیکنیشن تھا اور اپنی کلاس پر بے حد فخر مند۔ عام مزدور اور دیہاڑی کرنے والے لوگ اس کی نظر میں نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ میرا خاندان کس کلاس سے تعلق رکھتا ہے۔ میں نے بتایا کہ ہم لوگ حکومت کے گوشواروں میں زمیندار گنے جاتے ہیں، کیونکہ باپ دادا کے وقتوں سے زمین کے مالک ہیں۔ البتہ ابا جی گورنمنٹ سروس میں ہیں۔ اس سے اسکی تسلی ہوگئی۔ میں نے دل میں سوچا کہ ہندوستان میں ذات پات کی لعنت ہے اور انگلستان میں کلاس سسٹم کی بے ہودگی۔

اس سے اگلے روز کیرول مجھے اپنے شہر کی سیر کرانے کے بعد بولٹن جانے والی کوچ میں سوار کرا آئی۔ مجھے سمینار میں شرکت کے بعد جرمنی واپس لوٹ جانا تھا، جہاں پر میں نے ابھی صرف جرمن زبان کا امتحان پاس کیا تھا۔ ہائر ایجوکیشن کا مرحلہ میرے سامنے تھا، جس کے اختتام پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری کا حصول تھا۔ کیرول کے سامنے استانی کا کیریئر تھا، جس کیلئے اسے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ایجوکیشن ڈپلوما لینا تھا۔ اس کا پیشہ ورانہ مستقبل انگلستان میں تھا، جبکہ میں اس زمانے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں تعلیم کے خاتمے پر کس ملک میں رہائش اختیار کروں گا اور کونسا پیشہ اپناؤں گا۔ اس وجہ سے میرا خیال تھا کہ ہم اپنی مختصر داستان محبت کے نقطہء اختتام پر آن پہنچے ہیں۔

کیرول اس تعلق کو قائم رکھنے پر مصر تھی۔ اس کے خط باقاعدگی سے آنے لگے، جن کا جواب میری طرف سے التزام کے ساتھ دیا جاتا تھا۔ موسم بہار میں کیرول کی یونیورسٹی کا ایک گروپ پیرس جا رہا

تھا، جس میں وہ شامل ہونا چاہتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ میں بھی ان دنوں میں پیرس آ جاؤں۔ ہم نے دو ہفتوں میں اس شہر کی ہر قابل دید جگہ پر حاضری دی اور اپنے باہمی تعلق کی آئندہ نوعیت پر بحث کرتے رہے۔ بالآخر ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہماری دوستی قائم و دائم رہے گی۔ کیرول انگلستان میں اپنا مستقبل بنائے گی اور میں جرمنی میں اپنی تعلیم کو پایہء تکمیل تک پہنچانے کی سعی کروں گا۔ اسکے بعد میں کہاں جاؤں گا یا کیا کروں گا، اس امر کا فیصلہ مستقبل خود کرے گا۔

آئندہ سالوں میں ہمارا رابطہ ٹوٹ گیا۔ البتہ میرے پاس کیرول کے ماں باپ کا ایڈریس محفوظ تھا۔ جب مجھے لمبے عرصے کے بعد ایک بار لندن جانے کا موقعہ ملا، تو میں نے کیرول کے نام ایک خط اس پتے پر لکھا۔ خط ری ڈائرکٹ ہو کر کیرول تک پہنچ گیا۔ پتہ چلا کہ اس دوران میں اس کا باپ فوت ہو چکا تھا اور ماں ایک اولڈ ایج ہوم میں رہ رہی تھی۔ کیرول نے ٹیلی فون پر ماں کو بتایا کہ میں انگلستان آ رہا ہوں، جس کے دوران اس کی میرے ساتھ ملاقات ہوگی۔ تو ماں نے کہا کہ وہ مجھے دیکھنا چاہتی ہے۔ اس نے فرمائش کی کہ کیرول مجھے لے کر اس کے اولڈ ایج ہوم میں آ جائے، جو کروئیڈن کے مقام پر تھا۔

کیرول کی ماں کی عمر اسی سال کے لگ بھگ تھی۔ اسکے ہاتھوں میں رعشہ آ چکا تھا، مگر اسکا دماغ خوب کام کرتا تھا اور اس کی یادداشت میں کوئی حرج نہ آیا تھا۔ آنکھوں کی بینائی بھی اچھی تھی۔ اس کا مظاہرہ اس طرح ہوا کہ اس نے میری نکٹائی کے کلپ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ وہ کب سے میرے پاس ہے اور کیسے میری ملکیت میں آیا تھا؟ پھر اس نے کلپ کو قریب سے دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے کلپ اتار کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور مجھے اس پر لکھی ہوئی عبارت دکھائی، جس سے میں واقف تھا، مگر جس کی قدر و قیمت کا مجھے اندازہ نہ تھا۔ اس نے کہا:

"اس پر میرے بھائی رچرڈ رائٹ کا نام کندہ ہے اور ۱۹۳۹ء کا سن، جس سال اسے ہندوستان بھیجا گیا تھا۔ یہ کلپ میں نے اسے روانگی کے وقت تحفہ میں دیا تھا۔ عرصہ ہوا رچرڈ کی طرف سے ہمیں کوئی خبر نہیں ملی کہ وہ کہاں ہوتا ہے اور اس کا کیا حال ہے"۔

اب مجھے یاد آیا کہ وہ کلپ مجھے راولپنڈی میں اس انگریز نے عید کے موقعہ پر دیا تھا، جو اتوار کے روز دوپہر کا کھانا ہمارے گھر پر کھایا کرتا تھا۔ میں نے کیرول کی ماں کو بتایا کہ اس کا بھائی رچرڈ ہندوستان کی آزادی کے بعد اپنی مرضی سے راولپنڈی میں رہ گیا تھا، پاکستانی شہریت حاصل کرنا چاہتا تھا اور دو برسوں تک ہر اتوار کے روز ہمارے گھر پر آیا کرتا تھا، جہاں پر ابا جی اس کو اسلام کی تعلیم کے

بارے میں بتایا کرتے تھے۔ میں نے اسے ایک بار صدر کے علاقے میں ایک انگریز عورت کے ساتھ دیکھا تھا، جس کو وہ اپنی سائیکل پر بٹھا کر لے جا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ سائیکل سے اتر گیا تھا اور اس نے کہا تھا:

"ام اس اورت کے سات شادی بنائے گا"۔

مگر بدقسمتی سے اس کی نوبت نہ آئی۔ ایک شام کو جب وہ چک لالہ سے اصغر مال روڈ کی طرف سائیکل پر جا رہا تھا، کسی ڈاکو نے اس کو لوٹنا چاہا۔ اس زمانے میں یہ سڑک بالکل سنسان علاقے میں سے گذرتی تھی۔ دور دور تک کوئی آبادی نہ تھی۔ ڈاکو نے اسے امیر آدمی سمجھتے ہوئے چاقو سے اس پر حملہ کیا۔ پھر اس کو زخمی حالت میں چھوڑ کر اس کی سائیکل لے کر بھاگ گیا۔ رچرڈ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے میڈیکل ایڈ ملنے سے پہلے مر گیا۔ میں بھی ابا جی کے ساتھ اس کے جنازے میں شامل ہوا تھا۔ البتہ اس کی تدفین انگریز کالونی کے اصرار پر گوروں کے قبرستان میں ہوئی تھی۔

(شوین برگ۔ ۱۶ اپریل ۲۰۰۰ء)

کچا علم

یہ کون عورت تھی ، جو میرا نام پکار رہی تھی ۔ آواز کہیں دور سے آ رہی تھی ۔ البتہ لہجہ مانوس تھا ۔ بالکل منفرد لہجہ ۔ اس آواز میں ایک جانی پہچانی کھنک تھی ، جو ایک زمانے میں مجھے بہت بھاتی تھی ۔ عرصہ ہوا کسی نے میرا نام اس طرح نہیں لیا تھا ۔ مجھے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ میں اس آواز کو کیسے جانتا ہوں ۔ اور وہ کون عورت تھی ، جو مجھ پر جھکی ہوئی مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی ، مگر جس کی بات میرے پلے نہیں پڑ رہی تھی ۔ پھر میں نے اسے کہتے ہوئے سنا :

" میں ڈاکٹر ساندرا ہوں اور میں نے آپ کا بائی پاس اپریشن کیا ہے ، جو کامیاب رہا ہے ۔ میں آپ کو اس غیر فطری نیند سے بیدار کرانا چاہتی ہوں ، جس میں ہم نے آپ کو اپریشن کی خاطر ڈالا تھا " ۔

میں اس آواز اور لہجے سے خوب واقف ہوں ۔ مگر حافظہ میرا ساتھ نہیں دے رہا ۔ اس کی شکل وصورت بھی مجھے مانوس لگتی ہے ۔ اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں پڑتا کہ ڈاکٹر ساندرا نے کیا کہا اور میں نے کیا جواب دیا ۔ شاید میں پھر نیند کی راجدھانی میں جا پہنچا تھا ۔ کیونکہ جب میری آنکھیں کھلیں ، تو دن چڑھ چکا تھا اور اگلی تاریخ آ گئی تھی ۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس دوران میں ایک پورا دن گذر گیا تھا ۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی ۔ میں نے چوبیس گھنٹوں سے کچھ کھایا پیا نہیں تھا ۔ اپریشن سے آٹھ دس گھنٹے پہلے سے ہر قسم کی خوراک رسانی کی ممانعت کر دی گئی تھی ۔ حتیٰ کہ پانی کا ایک گھونٹ تک میرے لبوں سے نیچے نہ اترا تھا ۔

میں نے گھنٹی بجا کر نرس کو بلایا اور اسے ناشتہ لانے کو کہا ۔ مگر پیشتر اسکے کہ نرس ناشتہ لے کر لوٹتی ، پھر ایک بار ڈاکٹر ساندرا میرے بستر کے پہلو میں کھڑی تھی ۔ اس نے اسٹیتھس اسکوپ لگا کر میرے دل کی دھڑکن کو سنا ، نبض کو ٹٹولا اور بلڈ پریشر کو چیک

کیا۔ پھر اس نے میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور کہا:

" آپ جانتے ہیں کہ آپ کی اوپن ہارٹ سرجری ہوئی ہے۔ چونکہ آپ کی عام صحت اچھی ہے، اس لئے اپریشن کے کوئی منفی اثرات نظر نہیں آ رہے۔ کل تک آپ چلنے پھرنے لگیں گے اور اگر کسی وجہ سے کوئی پیچیدگی پیدا نہ ہوئی، تو اسی ہفتہ کے اندر اندر آپ گھر واپس جا سکتے ہیں"۔

میں اس دوران میں ٹکٹکی باندھے ہوئے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا، کیونکہ مجھے اس میں کسی جانی پہچانی لڑکی کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ اس کی آواز کی کھنک کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ اس کے سہارے پر میں اس معمہ کو حل کر لوں گا۔ مگر میرے دماغ کا ایک حصہ شاید بدستور محوِ خواب تھا اور میری مدد کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔

میرے ذہن کے پردے پر جو تصویر ابھری، وہ ایک سات سالہ لڑکی کی تھی، جس سے میں چالیس سال ادھر ملا تھا۔ دراصل میرا تعارف اس کے ماں باپ کے ساتھ ہوا تھا، جن کے ہمراہ میں ایک ہی طیارے میں روم سے آیا تھا۔ میرا جہاز کراچی سے لیٹ آیا تھا۔ ہمبرگ جانے والی فلائیٹ تیار کھڑی تھی۔ صرف میرا انتظار ہو رہا تھا۔ پی آئی اے کا جہاز رکتے ہی لفت ہانزا کا ایک کارکن تیر کی طرح ہمارے طیارے کی سیڑھیوں پر چڑھا۔ سواریاں ابھی اپنی سیٹوں سے نہ اٹھی تھیں۔ اس نے ہمبرگ جانے والی سواری کے بارے میں پوچھا۔ میں نے اپنا بازو ہوا میں لہرا دیا۔ پھر سیٹ پر سے اٹھتے ہوئے اپنی کمر کو سیدھا کیا اور اپنے ساتھ سفر کرنے والے ایک دوست سے لمبا معانقہ کیا، جسے روم سے نائجیریا جانے والی فلائیٹ لینی تھی۔ لفت ہانزا کے کارکن کو ہماری الوداعی رسم کی لمبائی شاید پسند نہ آئی۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے بازو سے پکڑا اور پوچھا:

" آپ کا بیگ کونسا ہے؟"

میں نے اپنا بیگ اگلی سیٹ کے نیچے سے نکالا اور پیشتر اس کے میں اپنے دوست سے باضابطہ رخصت لیتا، لفت ہانزا کا آدمی مجھے اپنے پیچھے کھینچتا ہوا جہاز سے باہر نکلا۔ رن وے پر پہنچ کر اس نے میرا بیگ تھام لیا اور کہا کہ ہمیں لفت ہانزا کے طیارے تک، جو وہاں سے اندازاً ایک سو گز کے فاصلے پر کھڑا تھا اور جس کے انجن اسٹارٹ کئے جا چکے تھے، دوڑ لگانی ہوگی۔ اس نے کہا:

" آپ کا باقی ماندہ سامان اگلی فلائیٹ میں آ جائے گا"۔

مجھے ایک ادھیڑ عمر جرمن جوڑے کے پہلو میں فرسٹ کلاس میں سیٹ ملی، جو شاید اس طیارے کی واحد خالی سیٹ تھی۔ مرد تو خیر ہر بات پر بس مسکرا دیتا تھا، کیونکہ میری انگریزی اس کے پلے نہ پڑتی تھی۔ البتہ عورت کو انگریزی اچھی خاصی آتی تھی۔ وہ ہمارے درمیان مترجم بن گئی۔ اس کا خاوند پیشہ کے اعتبار سے سرجن تھا اور روم میں ایک میڈیکل کانفرنس میں شرکت کرنے کے بعد اپنے شہر لیوبک واپس لوٹ رہا تھا۔ جو ہمبرگ کے قریب واقع ہے۔

" کیا یہ آپ کا جرمنی کا پہلا سفر ہے؟" ڈاکٹر سنتوسکی نے پوچھا۔ وہ میری باتوں سے جان چکے تھے کہ میں ہمبرگ سے ناواقف تھا اور ہوائی اڈے پر مجھے لینے کے لئے کوئی نہیں آئے گا۔ انہوں نے کہا کہ ان کا بیٹا کار لے کر آیا ہوگا۔ اگر دن کا وقت ہوتا، تو وہ مجھے میری رہائش گاہ تک پہنچانے کے لئے تیار تھے۔ مگر ہم رات کے دس بجے پہنچیں گے اور انہیں اپنے شہر لیوبک پہنچتے پہنچتے آدھی رات ہو جائے گی۔ میں نے کہا:

" اگر انسان کے منہ میں زبان موجود ہو اور اس کی جیب میں ایک واقف کار کا پتہ محفوظ ہو، تو پھر بھلا کیا مشکل پیش آ سکتی ہے؟"۔

ڈاکٹر سنتوسکی کی بیوی مارگٹ نے بتایا کہ ان کے تین بچے ہیں۔ بڑا لڑکا یورگ میری عمر کا ہے، جب کہ دوسرا بیٹا کارل ہائی اسکول میں پڑھ رہا ہے۔ ان کی بیٹی ایویلین ابھی بمشکل سات برس کی ہے۔ یورگ اچھی خاصی انگریزی بول لیتا ہے۔ اسے مجھ سے مل کر بہت خوشی ہوگی۔ وہ یوں بھی دوسرے ملکوں میں دلچسپی لیتا ہے اور دنیا جہان کے ڈاک کے ٹکٹ جمع کرتا ہے۔

" ڈاک کے ٹکٹ میں بھی ایک زمانے میں جمع کیا کرتا تھا۔ کچھ ٹکٹ تو اب بھی میرے بیگ میں پڑے ہیں، جن کا میں یورگ کے ساتھ تبادلہ کرونگا۔ میں نے اسکول کے زمانے میں ٹکٹ جمع کرنے شروع کئے تھے۔ اس سلسلہ میں میری مراسلت دنیا کے کئی ملکوں میں رہنے والوں سے ہوتی تھی۔ جب میں اسکول کی آخری کلاس میں تھا، تو میرے نام آنے والے خطوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی کہ میرے والدین کو خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں ٹکٹیں جمع کرنے کا خبط میری تعلیم میں ہارج نہ ہو جائے۔ اس لئے مجھے اس سے روک دیا

گیا۔ میں نے اپنی لمبی چوڑی مراسلت کوتو بند کر دیا، مگر ٹکٹ جمع کرنے کا شوق میرے دل کی گہرائیوں میں بیٹھ چکا تھا۔ اس سے میں آج تک اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکا ہوں"۔

" ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے کا شوق مجھے بھی رہا ہے" ڈاکٹر سنتو وسکی نے کہا: " مگر دوسری عالمگیر جنگ کے زمانے میں میرا البم جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے اس مشغلے کی طرف رجوع نہیں کیا۔ یوں بھی جنگ کے بعد ہمیں از سرنو اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے لئے بہت تگ و دو کرنی پڑی تھی۔ یورگ کی نسل کے بچے اس چیز کو بھلا کیا جانیں"۔

" تمہاری ہر بات کی تان جنگ پر آن کر ٹوٹتی ہے"۔ مارگٹ نے جھنجھلا کر کہا: " یہ ہماری نسل کی میراث ہے۔ بچوں کو اس میں بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ وہ اپنی زندگی موجودہ زمانے کے مطابق گذارنا چاہتے ہیں، جس میں ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے کا شوق پورا کیا جا سکتا ہے"۔

" معاف کیجئے، میری بیوی جنگ کے بارے میں تھوڑی الرجک ہے"۔ ڈاکٹر سنتو وسکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

" اور میرے میاں کو جنگ کے سوا کوئی دوسرا موضوع گفتگو کیلئے نہیں سوجھتا"۔ مارگٹ نے آنکھیں مچکاتے ہوئے کہا۔

" میں جنگ کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتا ہوں" میں نے کہا: " کیا یہ سچ ہے کہ جرمنی نے ایٹم بم بنا لیا تھا، مگر اس کی تباہ کاری کے پیش نظر ہٹلر نے اس کے استعمال کی اجازت نہ دی تھی؟"

" یہ سب قصے کہانیاں ہیں۔ اگر ہٹلر کے ہاتھ میں ایٹم بم آ جاتا، تو وہ شکست سے بچنے کے لئے یقیناً سارے یورپ کو تباہ کر دیتا" مارگٹ نے اپنے خاوند کے منہ کھولنے سے پہلے یہ بات کہہ دی۔ چونکہ اس کے پلے کچھ نہ پڑا تھا، اسلئے وہ جاننا چاہتا تھا کہ اسکی بیوی نے کیا کہا تھا۔ مجبوراً مارگٹ کو اسے یہ بات جرمن میں بتانی پڑی۔

" ہٹلر کے بارے میں تو ہم محض قیاس کر سکتے ہیں، مگر امریکیوں نے اسے استعمال کر کے دکھا دیا"۔ ڈاکٹر سنتو وسکی کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

" آج کل امریکہ اور سوویٹ یونین ایک دوسرے کو کھلم کھلا ایٹم بم کے استعمال کی

دھمکیاں دے رہے ہیں" میں نے کہا۔

" سرد جنگ میں ہر چیز ممکن ہے۔ اگر ایٹم بم کے استعمال تک نوبت آ گئی، تو اس کا سب سے پہلا نشانہ جرمنی بنے گا۔ روس مغربی جرمنی کو تباہ کر دے گا اور امریکہ مشرقی جرمنی کو۔ اس کے بعد شاید دونوں مل کر اپنی فتح کا جشن منائیں گے"۔

مارگٹ نے ڈاکٹر سنتو وسکی کی بات کا ترجمہ تو کر دیا، مگر اس کے چہرے بشرے سے صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کو یہ بات پسند نہ آئی تھی۔

" سونے کا انڈہ دینے والی مرغی کو وہ بھلا کیوں قربان کرنے لگے؟" میں نے کہا۔

ڈاکٹر سنتو وسکی نے گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا۔ انہیں شاید یہ احساس تھا کہ میں ان کے جذبات کو سمجھتا ہوں اور ان سے متفق تھا۔ انہوں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ جیب سے نکال کر مجھے دیا۔

" میں آپ کو کسی ویک اینڈ پر اپنے گھر آنے کی دعوت دوں گا۔ ہم آپ کو اپنا شہر لیوبک دکھائیں گے اور بیٹھ کر اطمینان سے بات چیت کریں گے"۔

میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے انکی دعوت کو قبول کیا۔ اس دوران میں ہمارا طیارہ ہمبرگ کے ہوائی اڈے پر اترنے کیلئے چکر کاٹ رہا تھا۔ ہمبرگ کا جگمگاتا ہوا اور حد نظر تک پھیلا ہوا شہر ہمارے قدموں میں پڑا تھا۔ میں ایک چھوٹے سے قصبہ سے آیا تھا، جہاں پر زندگی سست روی کی عادی تھی۔ اسکے برعکس بیس لاکھ کی آبادی کے اس شہر میں ہر طرف بھاگ دوڑ کا نظارہ تھا۔ ٹیکسیوں کی قطار اتنی لمبی تھی کہ اس کا آخری سرا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو اپنے واقف کار کا پتہ دیا، جسکے بارے میں مجھے امید تھی کہ وہ ٹیکسی کا کرایہ ادا کر دے گا۔ خود میری جیب میں ایک مارک بھی نہ تھا۔ اس وقت ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ہوا میں خنکی ضرور تھی، مگر یخ بستگی کا عالم نہ تھا، جس سے مجھے چلنے سے قبل جرمنی سے واقفیت رکھنے والے دوستوں نے یہ کہہ کر ڈرایا تھا کہ اکتوبر کے اواخر میں شمالی جرمنی ٹھنڈی ہواؤں کے پنجے میں ہوتا ہے۔ اس وقت تک میرے ذہن میں یہ بات بالکل نہ آئی تھی کہ اگر میرا واقف کار اس شام گھر پر نہ ہوا، تو میں ٹیکسی کا کرایہ کیسے ادا کروں گا۔ خدا کا شکر ہے کہ ایسی کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ میرا

مہمان نواز گھر پر موجود تھا اور ٹیکسی کا کرایہ بھی اس نے بلا چوں و چراں ادا کر دیا۔

مجھے ہمبرگ کے گلی کوچوں سے واقفیت پیدا کرنے میں پورا ایک مہینہ لگ گیا۔ اس دوران میں میرا یونیورسٹی میں داخلہ بھی ہو گیا، جس کا سردیوں کا سمسٹر چند دنوں میں شروع ہونے والا تھا۔ مگر ڈاکٹر سنتوسکی کے ساتھ ویک اینڈ کا پروگرام بنانا ایسا آسان کام نہ تھا۔ میں نے دو ایک بار فون کیا، مگر ان کی مصروفیت کے سبب بات نہ ہو سکی۔ یوں بھی میں چاہتا تھا کہ تھوڑی بہت جرمن سیکھنے کے بعد ان کے ہاں جاؤں، تاکہ مارگٹ کو ترجمہ کرنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ جرمن زبان کا کورس یکم نومبر سے شروع ہو گیا۔ میرے پاس چونکہ اور کوئی مشغلہ نہیں تھا، اس لئے سارا دن کسی نہ کسی رنگ میں جرمن سیکھنے میں گذرنے لگا۔

وسط دسمبر میں ڈاکٹر سنتوسکی کا فون آ گیا۔ مگر چونکہ ان سے براہ راست بات نہ ہو سکتی تھی، اس لئے مارگٹ ہمارے درمیان ٹیلی فون ایکسچینج کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا میں کرسمس کا تہوار ان کی فیملی کے ساتھ گذارنے کو تیار ہوں۔ میری معلومات کرسمس کے بارے میں بہت محدود تھیں، مگر میں نے سن رکھا تھا کہ جرمنی میں یہ تہوار خالص فیملی آفیر ہے، جس میں باہر کے کسی شخص کو شامل نہیں کیا جاتا۔ میں نے کہا:

"یہ تو آپ کا فیملی تہوار ہے، میں کسی دوسرے موقعہ پر آ جاؤں گا"۔

مگر پیشتر اس کے کہ ڈاکٹر سنتوسکی میری بات کا جواب دیتے، مارگٹ نے کہا:

"ہم جرمنی میں تمہاری فیملی ہی تو ہیں"۔

واضح ہے کہ اس فقرے کے بعد میں ان کی دعوت کو رد نہ کر سکتا تھا۔

انہوں نے کہا کہ میں ۲۴ دسمبر کی سہ پہر تک پہنچ جاؤں تو خوب رہیگا۔ کیونکہ اس روز ان کے بیٹے کارل کی سالگرہ بھی تھی۔ میں نے شامل ہونے کی ہامی بھر لی، مگر مجھے بالکل پتہ نہ تھا کہ مجھے کارل کے لئے سالگرہ کا کیا تحفہ لے جانا ہوگا اور کیا مجھے خاندان کے دوسرے افراد کے لئے کرسمس کے تحائف لے جانے چاہیئں یا نہیں۔

میرے واقف کار نے کہا کہ مجھے کوئی بہانہ بنا کر شامل ہونے سے انکار کر دینا چاہیئے۔ اس نے کہا: "یہ امیر لوگ ہیں، تم ان کے لئے کیا تحائف لے جا سکتے ہو؟"

مجھے اس بات سے اتفاق نہ تھا۔ میں نے سوچا کوئی چھوٹی موٹی کتاب کہیں نہ کہیں سے ہاتھ لگ جائے گی ۔ پھر سچ مچ سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی ایک دوکان میں مجھے بالزاک کی ایک کتاب کا جرمن ترجمہ مل گیا، جس کا اس وقت تک کسی نے کورتک نہ کھولا تھا۔ یہ کتاب ، جسے دراصل میں خود پڑھنا چاہتا تھا، میں نے کارل کے لئے مخصوص کر دی ۔ دیگر افراد خانہ کے لئے بھی اسی دوکان میں نہایت عمدہ نئی نکور کتابیں کوڑیوں کے مول مل گئیں ۔ سب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ مجھے جرمن ادیب وولفگانگ بورشرٹ کے افسانوں کا مجموعہ مل گیا۔ اس وقت مجھے ابھی پتہ نہ تھا کہ بورشرٹ جنگ عظیم کے بعد پیدا ہونے والے جرمن ادب کا اولین نام تھا۔ اس کی کہانی " اس منگل کے روز " میرا جرمن ادب سے پہلا ترجمہ تھا، جسے میں نے جرمنی میں قیام کے ابتدائی دنوں میں اردو میں ڈھالا تھا اور جسے ہفتہ وار " قندیل " لاہور نے خاص نوٹ دے کر چھاپا تھا۔

ڈاکٹر سنتوسکی اپنی بیوی مارگٹ اور بیٹی ایویلین کی ہمراہی میں مجھے لینے کیلئے ریلوے اسٹیشن پر آئے ہوئے تھے۔ ایولین سچ مچ ایک خوبصورت گڑیا تھی۔ انہوں نے کہا:

" گھر جانے سے پہلے ہم آپ کو لیوبک کے اہم حصوں کی سیر کرا دیتے ہیں "۔

لیوبک کے بارے میں مجھے صرف اتنا پتہ تھا کہ تھوماس من اس شہر کا نامور سپوت تھا۔ میں نے اس وقت تک اسکی کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی ، مگر اسکے ناول " بڈن بروک " کے نام سے واقف تھا۔ جس پر اسے ادب کا نوبل پرائز ملا تھا۔ ڈاکٹر سنتوسکی نے کہا:

" کیوں نہ ہم اس عمارت کو دیکھتے چلیں ، جو " بڈن بروک " کا لوکیل ہے اور جس میں تھوماس من کا خاندان رہائش پذیر تھا "۔

قدیمی عمارتیں ، شہر کے ساتوں گرجا گھر اور زمانہ ہائے وسطی کی تنگ گلیاں مجھے جادو کے زور سے بنائی ہوئی لگتی تھیں ۔ پرانے وقتوں کے گھر اتنے چھوٹے تھے، جیسے انسانوں کے لئے نہیں بالشتیوں کے لئے بنائے گئے ہوں ۔ میں یہ جان کر حیران ہوا کہ ان میں بدستور لوگ بستے ہیں ۔ ڈاکٹر سنتوسکی نے مجھے اوپر کی منزلوں کی کھڑکیوں میں لگے ہوئے آئینوں کی طرف متوجہ کیا ، جو اس طرح لگائے گئے تھے کہ انسان کمرے کے اندر بیٹھے ہوئے دیکھ سکتا ہے کہ نیچے سڑک پر سے کون گذر رہا ہے۔ انہوں نے کھڑکیوں

میں رکھی ہوئی گدیاں دکھائیں، جن پر گھر کے باسی کہنیاں ٹیک کر گھنٹوں تک کھڑے رہتے ہیں اور گلی کی زندگی کا نظارہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سنتوسکی کا بنگلہ ایک پارک نما علاقے میں تھا۔ جس کے پچھواڑے سے ایک ندی گذرتی تھی۔ اس سال جرمنی میں کرسمس سے پہلے ہی سردی کی لہر آ گئی تھی۔ متواتر کئی روز سے درجہ حرارت نقطہ انجماد سے دس سے پندرہ ڈگری نیچے چل رہا تھا۔ میں نے بتایا کہ ہمبرگ کی جھیل آلسٹر کا پانی جمنے لگا تھا۔ ایویلین نے کہا کہ ندی پر یخ کی سطح اتنی پختہ ہو چکی ہے کہ انسان اس پر چل سکتا ہے۔ اسے امید تھی کہ وہ کرسمس کے دنوں میں اس پر اسکیٹنگ کر سکے گی۔ ڈاکٹر سنتوسکی نے معنی خیز نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور کہا:

" کون جانتا ہے کہ اس برس سانتا کلاؤس ایویلین کے لئے کیا تحفے لائے گا"۔

اس عرصہ میں ہم ان کے گھر میں داخل ہو چکے تھے۔ یورگ اور کارل دروازے پر میرا استقبال کرنے کے لئے کھڑے تھے۔

یورگ یونیورسٹی میں قانون پڑھتا تھا اور کرسمس کی چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا۔ اسے انگریزی بولنے کا شوق تھا، جب کہ میں جرمن بولنے پر مصر تھا۔ یہ بات کارل کو اچھی لگی، کیونکہ اس کی انگریزی میری جرمن کی طرح ناپختہ تھی۔ اسے خوشی تھی کہ میں اس کی سالگرہ میں شامل ہونے کے لئے آیا تھا۔ وگرنہ کرسمس کی وجہ سے ہر سال اس کی سالگرہ کی تقریب کو بھلا دیا جاتا تھا۔ اس روز البتہ یہ پروگرام بنایا گیا تھا کہ سالگرہ کی تقریب الگ منائی جائے گی۔ چنانچہ ہمیں اس کے اپارٹمنٹ میں جمع ہونے کو کہا گیا، جو بنگلے کے شرقی حصے میں تھا۔ کارل کو تحفوں سے لاد دیا گیا۔ وہ ابھی ان کو کھولنے میں لگا ہوا تھا کہ اس کے کمرے کے سامنے ایک فولکس واگن کار آ کر رکی۔ کاروں کی ایک مقامی فرم کا کارندہ اتر کر آیا اور اس نے کارل کو کار کی چابیاں اور کار کی ملکیت کے کاغذات پیش کئے۔ اس روز کارل کی اٹھارویں سالگرہ تھی اور ماں باپ نے اس کو کار تحفے میں دی تھی۔ یہ چیز اگرچہ متوقع تھی، اس کے باوجود کارل کی خوشی کی کوئی انتہاء نہ تھی۔ وہ دوسرے سارے تحفوں کو چھوڑ کر کار میں جا بیٹھا۔ اس نے مجھے اور ایویلین کو شہر کی سیر کے لئے چلنے کی دعوت دی۔ ڈاکٹر سنتوسکی نے کارل سے آدھ گھنٹہ میں واپس آ جانے کا

وعدہ لے کر ہمیں جانے دیا۔

ہم واپس لوٹے تو بنگلے کے ہال میں کرسمس کا درخت سجایا جا چکا تھا۔ اس پر رنگا رنگ کے چاند، ستارے، دیو مالائی کہانیوں کے کردار، فرشتے، حوریں اور قسم قسم کے کھلونے لٹک رہے تھے۔ اس پر مستزاد سرخ و سفید موم بتیاں لگی ہوئی تھیں، جو ہمارے کمرے میں داخل ہونے پر روشن کر دی گئیں۔ مکان کے اندر درخت کا لگایا جانا اور اس کا کسی دولہن کی طرح سجایا جانا میرے لئے نئی چیز تھی۔ کرسمس کے درخت کے نیچے خاندان کے ہر فرد کے لئے تحفوں کا الگ الگ ڈھیر لگا ہوا تھا۔ مجھے بھی خاندان کے جملہ افراد کی طرف سے تحفے دیئے گئے تھے۔ ایویلین کو اس کی توقع کے مطابق اسکیٹنگ سیٹ ملا تھا۔ اس کی خوشی کی کوئی انتہاء نہ تھی۔ اگر اس وقت باہر اندھیرا نہ چھا گیا ہوتا، تو وہ اسی وقت ندی کے یخ بستہ پانی پر اسکیٹنگ کے لئے جانے کو تیار تھی۔ ڈاکٹر سنتوسکی اتنے میں پیانو پر کرسمس کے گیتوں کی دھنیں بجا رہے تھے۔ چند منٹوں کے اندر سارا خاندان مل کر کرسمس کے گیت گا رہا تھا۔ مجھے یہ رسم بہت اچھی لگی، مگر اس بات کا افسوس ہوا کہ میں ان میں سے کوئی گیت نہ جانتا تھا اور اگر جانتا بھی ہوتا، تو میں ان کا ساتھ نہ دے سکتا تھا، کیونکہ مجھے سرے سے گانا نہیں آتا۔

"تم کو گانا نہیں آتا، تو کیا ہوا"۔ مارگٹ نے کہا: "تم کو یقیناً ہاتھ کی لکیریں پڑھنا آتا ہوگا۔ ہندوستان میں سنا ہے لوگوں کو پامسٹری کا علم آتا ہے"

مجھے یہ اعتراف کرنا پڑا کہ جرمنی آنے سے دو تین سال قبل تک میں علم پامسٹری کا طالب علم رہ چکا تھا۔ ان برسوں میں ہفت روزہ "قندیل" میں پامسٹری کی کتابیں قسطوں میں چھاپی جاتی رہی تھیں۔ مجھے اور میرے دوستوں کو اس میں اتنی دلچسپی پیدا ہوئی تھی کہ ہم اس سلسلہ میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کرنے لگے۔ میں نے ایک پوری کتاب اس موضوع پر لکھ ڈالی تھی، جس میں اپنے دوستوں، رشتہ داروں اور دوسرے ملنے والوں کے ہاتھوں کے نقوش کو محفوظ کر دیا گیا تھا۔ میرے ارادہ چند برسوں کے بعد چیک کرنے کا تھا کہ آیا میری اس وقت کی پیش گوئیاں پوری اتری تھیں اور کیا لوگوں کے ہاتھوں کی لکیروں میں اس دوران میں کوئی تبدیلی آئی تھی یا نہیں۔

سب سے پہلے مارگٹ نے اپنا ہاتھ میرے سامنے رکھا اور مجھے ورطہء حیرت میں

ڈال دیا۔ اسکے ہاتھ کی لکیریں بتا رہی تھیں کہ وہ دو بار شادی کرے گی ،مگر صرف ایک بار اور وہ بھی عین جوانی میں بیوہ ہوگی ۔ اگر اس کا پہلا خاوند مر چکا تھا اور وہ بیوگی سے دو چار ہو چکی تھی ،تو پھر اس کی دوسری شادی کا خاتمہ یا تو طلاق کی صورت میں ہوگا یا اس طرح کہ وہ اپنے خاوند سے پہلے مر جائے ۔

مجھے اس وقت تک کسی نے نہیں بتایا تھا کہ یورگ اور کارل کا باپ مارگٹ کا پہلا خاوند تھا ، جو جنگ میں مارا گیا تھا ۔ ایویلین ڈاکٹر سنتو وسکی کی بیٹی تھی ۔ یہ بات مجھے اس وقت بتائی گئی ، جب میں نے مارگٹ سے کہا :

" دو سے زیادہ شادیاں آپ کی قسمت میں نہیں لکھی ہیں " ۔

یہ سن کر مارگٹ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور اس نے کہا :

" یہ میری دوسری شادی ہے ،مگر تم کو اس بات کا علم کیسے ہوا ؟ "

" یہ میرا پروفیشنل راز ہے ،جس کو کھولا نہیں کرتے " میں نے جواب دیا ۔

اس طرح میں دوسری بات کہنے سے بچ گیا ، جس کا تعلق مستقبل کے ساتھ تھا اور جس کے بارے میں مجھے یقین نہیں تھا ۔ تاہم میرے سارے شکوک اس وقت دور ہو گئے ، جب ڈاکٹر سنتو وسکی نے اپنا ہاتھ میرے سامنے رکھا ۔ ان کے ہاتھ کی لکیریں بتا رہی تھیں کہ وہ شخص کسی عورت کے ساتھ وفاداری نہیں نبھا سکتا ۔ میں نے ان کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ان کی قسمت میں صرف ایک بیٹی لکھی ہے ،مگر ڈون خوان کی طرح بے شمار عورتیں ، جو ان کی محبت کا دم بھرتی ہیں ،مگر وہ ان میں سے کسی کے ہاتھ نہیں لگیں گے " ۔

مارگٹ نے معنی خیز نظروں سے یورگ کی طرف دیکھا ، جو اس عرصے میں اپنا ہاتھ میرے سامنے پھیلا چکا تھا ۔ اس کے ہاتھ کی ساخت بتا رہی تھی کہ اس کے اندر ایک فوجی افسر چھپا بیٹھا ہے ۔ میں نے کہا :

" تم بیشک قانون پڑھتے رہو ،مگر تمہارا کیریر ملٹری میں جا کر بنے گا " ۔

کارل کا ہاتھ صاف بتا رہا تھا کہ وہ پیدائشی تاجر ہے ۔ اس بات کی تصدیق مارگٹ نے فوراً کر دی ، کیونکہ کارل بچپن سے چیزیں خریدنے اور ان کو آگے منافع پر بیچنے میں لگا رہتا تھا ۔

ایویلین کے ہاتھ کی لکیریں بتا رہی تھیں کہ اس کی زندگی کو ایک زبردست جھٹکا

لگے گا، جس کے نتیجے میں اس کو اپنی تعلیم نامکمل چھوڑنی پڑے گی۔ تاہم اس کی زندگی مالی خوش حالی میں گذرے گی۔ پھر ایک فقرہ میری زبان سے نکلا، جس کے لئے میرے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔ ایویلین کے ہاتھ کی لکیریں بتا رہی تھیں کہ وہ بے حد نافع الناس وجود ثابت ہوگی۔ میں نے کہا: "تمہارے ذریعہ بے شمار لوگوں کو زندگی ملے گی۔ ہوسکتا ہے کہ میں بھی ان لوگوں میں شامل ہوں"۔

پھر بات اس طرف نکل گئی کہ مارگٹ کے تینوں بچوں کی پیدائش غیر معمولی دنوں میں ہوئی تھی۔ یورگ عین مارگٹ کی برتھ ڈے پر پیدا ہوا تھا۔ اس طرح ماں بیٹے کی برتھ ڈے ایک ہی دن پر پڑتی تھی۔ کارل کرسمس والے دن پیدا ہوا تھا اور ایویلین ۳ مارچ ۱۹۵۳ء کو تین بج کر تین منٹ پر پیدا ہوئی تھی۔

ڈاکٹر سنتوسکی نے اپنی زندگی کے المیئے کا ذکر چھیڑ دیا، کیونکہ ان کی پیدائش ۲۹ فروری کو ہوئی تھی، جس کے سبب ان کی برتھ ڈے ہر چار سال کے بعد آتی تھی۔ وہ بچپن سے قدرت کی اس ناانصافی پر کڑھتے آئے تھے کہ ان کی سالگرہ دوسرے لوگوں کی طرح ہر سال نہ منائی جاسکتی تھی۔ مارگٹ نے کہا:

"کیوں نے ہم یسوع مسیح کی طرح، جو یقیناً کرسمس والے روز پیدا نہ ہوئے تھے، تمہاری سالگرہ سال کے کسی دوسرے دن منایا کریں"۔

ڈاکٹر سنتوسکی کو اس تجویز سے اتفاق نہ تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ اپنے آپ کو یسوع مسیح کے ساتھ ایک قطار میں کھڑا نہیں کرسکتے۔ میں نے انہیں چھیڑنے کے لئے کہا:

"پھر تو آپکو ڈون خوان کی ہمسری کے خلاف بھی احتجاج کرنا چاہیئے تھا"

"ڈون خوان کی ہمسری کو انہوں نے شاید اپنے لئے اعزاز جانتے ہوئے قبول کرلیا تھا"۔ مارگٹ نے کہا۔

آدھی رات تک ہماری محفل بڑے خوشگوار ماحول میں جاری رہی۔

اگلی صبح ناشتے کے بعد سیر کے لئے جانے کا پروگرام تھا۔ رات بھر برف باری ہوتی رہی تھی اور ہر چیز پر سفیدی کا ملمع ہوگیا تھا۔ جب ہم گھر سے نکلے، تو سورج بادلوں کے پیچھے سے شرمیلی دولہن کی طرح جھانک رہا تھا۔ آدھ پون گھنٹے میں اس نے اس حجاب کو ایک طرف دھکیل دیا اور کھلے بندوں دھرتی پر اپنی شعاعیں بھیجنے لگا، جو روشنی تو

پھیلا رہی تھیں ، مگر جن میں گرمی کی حدت نہ ہونے کے برابر تھی ۔ اس سال سردی نے سابقہ ریکارڈ توڑ دیئے تھے ۔

ڈاکٹر سنتو وسکی نے جمی ہوئی ندی کے یخ بستہ پانی پر چل کر اطمینان کیا کہ اس پر بلا خوف وخطر اسکیٹنگ کی جا سکتی ہے ۔ ایویلین نے اسکیٹنگ شوز پہنے اور دوسرے جوتے اتار کر ندی کی یخ پر اتر گئی ۔ اس کو اچھی خاصی اسکیٹنگ آتی تھی ۔ ماں باپ اور دونوں بھائی اس کی طرف سے مطمئن تھے ، اس لئے وہ لوگ اپنے کتے کے ساتھ کھیلتے بھاگتے ہوئے آگے نکل گئے ۔ میرے لئے وہ پہلا موقعہ تھا کہ کسی کو ندی کے یخ بستہ پانی پر چلتے ہوئے دیکھ رہا تھا ۔ اس لئے میں قدرتی طور پر کسی قدر فکرمند تھا ۔ میں سارا وقت ایویلین کے ساتھ ساتھ ندی کے کنارے پر چلتا رہا ۔

راستے میں ایک پل پڑتا تھا ، جو بمشکل اتنا اونچا تھا کہ ایویلین اس کے نیچے سے گذر سکتی تھی ۔ پھر وہی ہوا ، جس کا مجھے شروع سے خطرہ تھا ۔ پل کے نیچے یخ کی تہہ مضبوط نہ تھی اور ایویلین کے بوجھ تلے ٹوٹ گئی اور ایویلین میری آنکھوں کے سامنے دھڑام سے پانی میں گر گئی ۔ ندی کا پانی خاصا گہرا تھا ، جس میں ایویلین پوری کی پوری غائب ہو گئی ۔ مگر پھر سطح پر ابھری اور اس نے مدد کے لئے مجھے دہائی دی ۔ میں نے دیکھا کہ اس کے خاندان کے لوگ پل کے دوسری طرف میری آواز کی پہنچ سے باہر جا چکے تھے ۔ اب سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ میں خود ایویلین کی مدد کو پہنچوں ۔ میرے لئے یخ بستہ ندی کے پانی پر قدم دھرنے کا وہ پہلا موقعہ تھا اور مجھے خطرہ تھا کہ میں کہیں پھسل کر گر نہ جاؤں ۔ میرے اندر کے محتاط آدمی نے مجھے مشورہ دیا کہ ندی کی یخ پر پیٹ کے بل لیٹ جاؤ ۔ چنانچہ میں نے یہی کیا اور ایویلین کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا ۔ وہ دوسری بار پانی کی سطح پر ابھری ، تو اس نے میرے ہاتھ کو پکڑ لیا ۔ اب میں اسے آہستہ آہستہ کھینچتا ہوا پانی سے باہر لے آیا ۔ چونکہ ایویلین کے کپڑے پانی میں بھیگ چکے تھے ، اس لئے میں نے اپنا اوورکوٹ اتار کر اس پر ڈال دیا اور اسے کہا کہ اپنے گیلے کپڑے اتار دے ۔

اس کو ندی کے کنارے پر چھوڑ کر میں بھاگ کر پل کے اوپر چڑھا ، تاکہ اس کے خاندان کے افراد کو خبردار کر سکوں ۔ وہ لوگ دو تین سو میٹر کے فاصلے پر کھڑے ہمارا انتظار کر رہے تھے ۔ میرے اشارے سے وہ جان گئے کہ کوئی حادثہ پیش آ گیا تھا ۔

ایویلین کے دونوں بھائی ماں باپ کے پہنچنے سے پہلے ہمارے پاس پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے اپنے اوورکوٹ اتار کر ایویلین پر ڈال دیئے اور میرا اوورکوٹ مجھے دے دیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ تو سردی کا مقابلہ کرنے کی مشق رکھتے ہیں، مگر میرا یخ بستہ سرد ہواؤں سے پہلا واسطہ تھا۔ اتنے میں ڈاکٹر سنتو وسکی بھی آ گئے۔ انہوں نے ایویلین کا معائنہ کرنے کے بعد بیٹوں سے کہا کہ بہن کو جلد از جلد گھر پہنچائیں۔ یورگ نے ایویلین کو اپنے کندھے پر ڈالا اور تیز رفتاری سے گھر کی طرف چل دیا، جو وہاں سے دور نہ تھا۔ ہمارے گھر پہنچنے تک ایویلین کو تولئے سے پونچھنے کے بعد ایک گرم کمبل میں لپیٹ دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر سنتو وسکی نے بیٹی کو دوائی دی اور مارگٹ سے کہا کہ ایویلین کے لئے فوراً گرم گرم شوربہ تیار کیا جائے۔

آدھ پون گھنٹے میں ایویلین پھر وہی صحت مند لڑکی تھی۔ اسکے بال سکھائے جا چکے تھے اور وہ گرم کپڑوں میں ملبوس ہمارے درمیان بیٹھی ہوئی چہک رہی تھی۔ یورگ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"تمہاری کل رات والی پیش گوئی میں تم سے ایک غلطی ہوئی تھی۔ تم نے کہا تھا کہ ایویلین کسی وقت تمہیں موت کے منہ سے بچائے گی، جب کہ درحقیقت تمہیں کہنا چاہیئے تھے کہ تم اس کو موت کے منہ سے بچاؤ گے"۔

اب سارا خاندان پامسٹری کا مذاق اڑانے لگا۔ میں نے کہا کہ میں نے وہی باتیں دھرا دی تھیں، جن کو میں نے پامسٹری کی کتابوں میں پڑھا تھا۔ یورگ نے کہا کہ اس نے یہ بات گھر میں کسی کو نہیں بتائی تھی کہ اس نے دو ہفتے قبل ملٹری میں کمشن حاصل کرنے کیلئے درخواست بھیجی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ قانون کی ڈگری لیتے ہی ملٹری سروس میں چلا جائے۔ مارگٹ کو یہ بات سن کر پورا پورا یقین ہو گیا کہ میری پیش گوئیاں ساری کی ساری اپنے وقت پر پوری ہو جائیں گی۔ البتہ اسے یہ پتہ نہ تھا کہ میں نے اسکے خاندان کے بہت جلد بکھر جانے والی بات کسی کو نہیں بتائی تھی۔

دوسرے روز کارل مجھے اپنی کار میں ہمبرگ چھوڑنے کے لئے آیا۔ راستے میں اس نے بتایا کہ اس کے سوتیلے باپ کا اپنے مطب کی ایک نرس کے ساتھ معاشقہ چل رہا تھا، جس کا علم مارگٹ کو نہیں تھا۔ وہ یہ بات ماں کو بتا کر فکرمند نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کارل کو

ہاتھ کی لکیروں کے علم پر اعتبار نہ تھا۔ مگر وہ اس چیز پر حیران تھا کہ مجھے کیونکر محض ہاتھ کی لکیروں پر ایک نظر ڈالنے سے اس کے خاندان کے مسائل کا پتہ چل گیا تھا۔

چونکہ میں ہمبرگ میں رہتا تھا اور ڈاکٹر سنتو وسکی کا خاندان لیوبک میں مقیم تھا، اس لئے ہمارا سال بھر میں بمشکل ایک آدھ بار ملنا ہوتا تھا۔ اگلی ملاقات میں مارگٹ نے مجھے علیحدگی میں بتایا کہ وہ جلد یا بدیر اپنے خاوند سے طلاق لینے کا ارادہ رکھتی ہے۔ ڈاکٹر سنتو وسکی نے اپنی محبوبہ کو اپنے بنگلے کے اس حصے میں رہائش دے دی تھی، جو یورگ نے ملٹری سروس کو جائن کرنے پر خالی کیا تھا۔ مارگٹ کے دونوں بیٹے اس عرصہ میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہو چکے تھے۔ صرف ایویلین ابھی بہت چھوٹی اور اپنے باپ سے بہت مانوس تھی۔ طلاق ہونے کی صورت میں مارگٹ کو یقین تھا کہ ایویلین کی سرپرستی کا حق عدالت کی طرف سے اس کو مل جائے گا۔ مگر اس کو بنگلے سے نقل مکانی کرنی پڑے گی اور کرائے کے مکان یا فلیٹ میں جانا پڑے گا۔ وہ جانتی تھی کہ ڈاکٹر سنتو وسکی ماں بیٹی کو نفقہ دینے میں کنجوسی سے کام لیں گے۔ سب سے زیادہ وہ اس بات سے ڈرتی کہ ایویلین کی حساس طبیعت پر ماں باپ کی طلاق کا منفی اثر پڑے گا۔ اس کے اسکول کی آخری رپورٹ سے پتہ چلتا تھا کہ ایویلین کو سب باتوں کا پتہ تھا۔ اس کی استانی نے مارگٹ سے ایویلین کے بارے میں فکرمندی کا اظہار کیا تھا۔

اسکے بعد آئندہ برسوں میں میرا لیوبک جانا قریب قریب معطل ہو گیا۔ مارگٹ کے ایک خط سے مجھے پتہ چلا کہ وہ ایک علیحدہ فلیٹ میں منتقل ہو گئی تھی اور طلاق کی کاروائی شروع ہو چکی تھی۔ مجھے اتفاق سے انہی دنوں میں یونیورسٹی کے ایک گروپ کے ہمراہ لیوبک جانے کا موقعہ ملا، تو میں نے مارگٹ کو لکھا کہ میں گھڑی کی گھڑی اسے اور ایویلین کو ملنے کیلئے آؤں گا۔ دونوں نے گرم جوشی کیساتھ میرا استقبال کیا۔ مگر مجھے اندازہ تھا کہ اس خاندان کی خوشی ومسرت کے دن بیت چکے تھے۔ ڈاکٹر سنتو وسکی کی طرف سے ماں بیٹی کو نفقہ کے نام پر تھوڑی سی رقم ملتی تھی۔ مارگٹ نے کسی کلینک میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ایویلین نے کہا کہ اس کا اسکول کے خاتمے پر میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کا منصوبہ ماضی کا حصہ بن چکا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ جلد از جلد اپنے قدموں پر کھڑی ہو سکے۔

چند برسوں کے بعد مجھے ایویلین کا ایک کرسمس کارڈ امریکہ سے ملا، جہاں پر وہ

کسی ہوائی کمپنی میں ائر ہوسٹس تھی ۔ مارگٹ سے میں نے رابطہ کیا ،تو پتہ چلا کہ ایولین نے نیو یارک میں رہائش اختیار کر لی تھی اور جرمنی واپس لوٹنے کا ارادہ نہیں رکھتی ۔ مارگٹ نے مجھے اپنی سالگرہ کے موقعہ پر آنیکی دعوت دی ۔ اس روز اسکے دونوں بیٹے آئے ہوئے تھے ۔ بلکہ یورگ نے اس روز خاص طور پر مجھے دکھانے کے لئے فوجی وردی پہن رکھی تھی ۔ پتہ چلا کہ وہ اس دوران میں لیفٹینٹ کرنل کے عہدے پر پہنچ چکا تھا۔ کارل بزنس ایڈمنسٹریشن کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ایک فرم چلا رہا تھا ، جسکا کام ایسی فرموں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنا تھا ، جنکے دیوالیہ نکلنے کا خطرہ پیدا ہو چکا ہوتا تھا۔ ایویلین کے بارے میں بتایا گیا کہ اسنے ایک امریکن کروڑ پتی کے ساتھ شادی کر لی تھی ، جسکے ساتھ اسکی ملاقات کسی ہوائی سفر کے دوران ہوئی تھی ۔ وہ چاہتی تھی کہ مارگٹ اسکے پاس آ کر رہے ۔مگر مارگٹ اپنے بچوں کی محتاج نہ بننا چاہتی تھی اور ہر قیمت پر اپنی خودمختاری کو برقرار رکھنا چاہتی تھی ۔ اسلئے بدستور ایک کلینک میں کام کر رہی تھی ۔

اپریشن کے تیسرے روز ڈاکٹر ساندرا مجھے دیکھنے کے لئے آئی ، تو خلاف معمول جلدی میں تھی ۔ اس نے کہا کہ وہ تین روز کے لئے نیو یارک جا رہی ہے ۔ اس کو امید تھی کہ اس کی واپسی تک میری صحت اتنی بہتر ہو چکی ہو گی کہ مجھے گھر جانے کی اجازت دی جا سکے گی ۔ میں نے مذاق کرتے ہوئے کہا :

" کیا تم نیو یارک کو محض ہاتھ لگانے کے لئے جا رہی ہو؟ "

" نہیں یہ بات نہیں " اس نے کہا : " میں یہ بتانے کے لئے جا رہی ہوں کہ میں اس سال کے اختتام پر نیو یارک منتقل ہو جاؤں گی ، جہاں پر ایک میڈیکل ٹرسٹ کے ہسپتال میں ہارٹ اسپیشلسٹ کی جگہ خالی ہو رہی ہے ۔ یہ ٹرسٹ میری ماں نے اس وقت قائم کیا تھا ، جب میرے باپ کی اچانک ہارٹ اٹیک سے وفات ہوئی تھی ۔ اس کے علاوہ تین مارچ کے روز میری ماں کی سالگرہ ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اس روز اس کے تینوں بچے گھر آئیں " ۔

" کیا تم امریکن ہو؟"

" آدھی امریکن اور آدھی جرمن ۔ میرا باپ امریکی تھا ، جب کہ میری ماں جرمن ہے ۔ اس نے مجھے میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے اور جرمن زبان سیکھنے کے لئے جرمنی بھیجا

تھا ۔ یہاں پر لیوبک میں میری نانی رہتی ہے ، جس کے پاس رہتے ہوئے میں نے تعلیم حاصل کی ہے "۔

" کیا تمہاری ماں کی پیدائش تین مارچ ۱۹۵۳ء کے تین بج کر تین منٹ کی ہے اور اس کا نام ایویلین ہے؟ "

" ہاں ، مگر آپ کو اس بات کا کیسے پتہ چلا "۔ ڈاکٹر ساندرا نے حیران ہو کر پوچھا۔

" یہ ایک لمبی کہانی ہے ، جس کی تفصیل تمہیں ایویلین بتا سکتی ہے " میں نے کہا: " میری طرف سے اپنی ماں کو سالگرہ کی مبارک باد دینا اور کہنا کہ اس کے ہاتھ کی لکیروں نے جھوٹ نہیں بولا تھا ۔ صرف میرا علم کچا تھا ، جس کے سبب میں سمجھتا رہا کہ وہ میری زندگی بچائے گی ، جب کہ یہ کام اس کی بیٹی کے ہاتھوں سرانجام پایا جانا تھا"۔

(شوین برگ ۔ ۱۰ اپریل ۲۰۰۰ء)

نہلے پر دھلہ

میں ایک کانفرنس میں آدھا دن سر کھپانے کے بعد انسٹی ٹیوٹ میں پہنچا اور ابھی اپنے کمرے کے راستے میں تھا کہ میری سیکریٹری نے مجھے پیچھے سے آ لیا۔ اس نے کہا کہ ایک ادھیڑ عمر کی خاتون مجھے ملنے کے لئے آئی بیٹھی ہیں، جن کا کہنا ہے کہ آپ نے ان کے ساتھ آج کے روز ملاقات کا وقت طے کر رکھا ہے۔ میرے کیلنڈر میں کوئی اندراج نہیں تھا، نہ ہی مجھے یاد پڑتا تھا کہ میں نے کسی کو وقت دے رکھا ہے۔ میں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کرنے کی خاطر کندھوں کو اچکا دیا۔ محترمہ کو میرے کمرے میں انتظار کرنے کو کہا گیا تھا اور کافی کے ساتھ ان کی تواضع کی گئی تھی۔

میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے معذرت چاہی کہ محترمہ کو انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی تھی۔ دراصل مجھے بالکل یاد نہیں رہا تھا کہ میں نے ان کے ساتھ ملنے کے لئے وقت مقرر کر رکھا تھا۔

"ہم نے وقت طے نہیں کیا تھا، صرف دن کا تعین کیا تھا"۔ محترمہ نے مسکراتے ہوئے مصافحہ کے لئے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔

"معاف کیجئے میری یادداشت اب بھی میرا ساتھ نہیں دے رہی"۔ میں محترمہ کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھا، جو مجھے کچھ مانوس لگ رہا تھا۔ "یہ کب کی بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تیس برس قبل کی" محترمہ نے فاتحانہ مسکراہٹ سے جواب دیا "ہم نے یہ طے کیا تھا کہ آج کے روز میں تم سے ملنے آؤں گی"۔

"کیا تم ماریتا ہو؟" میری آواز میں اب بھی شک کی انڈر کرنٹ موجود تھی، مگر میں نے اس کو کلاوے میں لینے کے لئے دونوں بازو پھیلا دیئے تھے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہمیں آخری بار ملے ہوئے پورے تیس برس بیت چکے تھے۔

ماریتا کے ساتھ میری دوستی کی ابتداء ایک عجیب و غریب طریق سے ہوئی تھی۔ مجھے انسٹی ٹیوٹ کو جائن کئے ہوئے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا اور ابھی پوری زندگی میرے سامنے تھی۔ اس زمانے میں میری ڈاک پوسٹ بکس کی معرفت آتی تھی۔ ڈاک خانہ انسٹی ٹیوٹ کے پاس تھا اور میں صبح دفتر جاتے ہوئے راستے میں اپنی ڈاک دیکھ لیا کرتا تھا۔ میرے نام ایک ڈیلی اخبار آتا تھا۔ اس کے علاوہ ہر روز دو ایک خط اور مہینہ بھر میں بارہ پندرہ رسالے آ جاتے تھے۔ سوموار کے روز دوسرے دنوں سے زیادہ ڈاک

ہوتی تھی، کیونکہ ویک اینڈ کو ملا کر تین دنوں کی ڈاک اکٹھی ملتی تھی۔ مگر جتنی ڈاک اس سوموار کو آئی تھی، اس کا میں نے کبھی خواب بھی نہ دیکھا تھا۔ البتہ کسی خط پر میرا نام نہ تھا، صرف پوسٹ بکس نمبر درج تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ خط لکھنے والے میرے جاننے والے نہیں تھے۔ شاید میں سرے سے مکتوب الیہ نہیں تھا اور خط کسی غلطی فہمی کے سبب مجھے مل رہے تھے۔

میں نے خطوں کو چاک کیا تو پتہ چلا کہ وہ ایک مقامی اخبار میں چھپنے والے کسی اشتہار کے جواب میں آئے تھے اور سارے کے سارے لڑکیوں کے تھے۔ جن میں سے چند ایک نے اپنی تصویریں بھی بھیجی تھیں۔ دو ایک خاصی دلفریب تھیں، جب کہ دوسری بس لڑکیاں تھیں۔ مجھے تصویروں سے زیادہ ان کے ہینڈ رائیٹنگ میں دلچسپی تھی، جس کی مدد سے انسان کی شخصیت کو بہتر طور پر جانچا جا سکتا ہے۔ بیشتر لڑکیاں مجھے عامی لگیں، جن کا تعلیمی معیار پست تھا۔ اکثر کی لکھائی بھدی تھی اور صاف نظر آ رہا تھا کہ ان کو لکھنے کی کچھ ایسی مشق نہ تھی۔ میں اور تو سب کچھ برداشت کر لیتا ہوں، مگر بھدی لکھائی کے لئے میرے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں پایا جاتا۔ میں نے ان خطوں کو ایک طرف رکھ دیا اور دوسرے خطوں کی طرف متوجہ ہوا، جن کی لکھائی زیادہ ہموار اور پکی تھی۔ ایک خط بالخصوص ایسا تھا، جس کا نہ صرف ہینڈ رائیٹنگ اچھا تھا، بلکہ لکھنے والی اچھی بھلی آرٹسٹ تھی۔ اس نے خط کے نچلے حصے میں ایک دریا اور اس پر بادبانی کشتی کی تصویر بنائی تھی۔ ساحل پر ایک جوڑا بیٹھا ہوا اس دلفریب نظارے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی عمر چھبیس برس لکھی تھی، جو اس دن کے انتظار میں بیت رہی تھی، جب اس کا خواب پورا ہوگا۔

میں نے اس لڑکی سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنا پتہ نہیں دیا تھا، البتہ ٹیلی فون نمبر درج کیا تھا اور لکھا تھا کہ اس سے شام کے وقت رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

ٹیلیفون پر اس کی دھیمی آواز میرے کانوں کو بھلی لگی۔ میں نے اخبار میں چھپنے والے اشتہار کا حوالہ دیا، جس کے جواب میں اس نے خط لکھا تھا۔

"میں نے کوئی خط نہیں لکھا" اس نے ٹکا سا جواب دیا۔

"یہ بھی خوب رہی۔ تم نے خط نہیں لکھا اور میں نے اشتہار نہیں دیا تھا"۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اگر تم نے اشتہار نہیں دیا تھا، تو اس کے جواب میں آنے والے خط کیسے تمہارے ہاتھ لگے؟"

"خط مجھے پوسٹ بکس کی معرفت ملے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کسی اشتہار میں غلطی سے میرے

پوسٹ بکس کا نمبر چھپ گیا ہو۔ میرے پاس تمہارے نام سے آنے والا خط موجود ہے۔ اگر چاہو، تو میں اسے تمہیں دکھا سکتا ہوں"۔

" ہاں میں اس خط کو دیکھنا چاہتی ہوں ۔ کیا ہم سات بجے مین ریلوے اسٹیشن پر مل سکتے ہیں؟"

میں نے اس کی موہنی آواز کو سن کر اپنے ذہن میں جو تصویر بنائی تھی، ماریتا اس سے بڑھ کر خوبصورت نکلی ۔ واقعی اس جیسی سوہنی لڑکی کو دوست بنانے کے لئے کسی اشتہار کے جواب میں خط لکھنے کی ضرورت نہ تھی ۔ وہ نکلتے ہوئے قد بت کی ماڈل لڑکیوں جیسی عورت تھی۔ آنکھوں کا رنگ نیلا اور بالوں کا قدرتی بلونڈ تھا۔ یہی نشانی اس نے مجھے اپنی شناخت کے لئے بتائی تھی۔ میں نے اسے کہا تھا کہ ہماری جائے ملاقات پر میرے سوا شاید ہی کوئی دوسرا ایشیائی فرد موجود ہوگا ۔ یہ ان دنوں کی بات ہے، جب اس شہر میں میرے ہموطن اکا دکا پائے جاتے تھے۔ ایک قریبی ریستوران میں جا کر بیٹھنے اور کافی کا آرڈر دینے کے بعد میں نے خط اس کے سامنے رکھا اور پوچھا:

"اگر یہ خط تم نے نہیں لکھا، تو کیا تم قیاس کر سکتی ہو کہ کس نے تمہاری جگہ پر لکھا ہوگا"۔

"میں اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ہوسکتا ہے کہ میری کسی سہیلی نے شرارت کی ہو"۔

میں نے اسے دو تین فقرے کاغذ پر لکھنے کو کہا۔ پہلے تو وہ تیار نہ ہوتی تھی، کیونکہ اسے یہ بات امتحان لینے اور تفتیش کرنے کے برابر لگی۔ پھر کچھ دیر تک حیل و حجت کرنے کے بعد اس نے سارے خط کی نقل میرے سامنے تیار کی۔ دونوں خطوں کی لکھائی میں نمایاں فرق تھا۔ مجھے اس کی لکھائی خط کی لکھائی سے بڑھ کر پسند آئی۔

اب اس کی تفتیش کرنے کی باری تھی۔ اس نے ریستوران کے بیرے سے کہا کہ ہمیں مقامی اخبار کا ویک اینڈ والا شمارہ لا کر دے۔ اس ریستوران میں کئی ایک روزنامے اور رسالے آتے تھے، جو گاہکوں کے پڑھنے کیلئے ہوتے تھے۔ بیرا کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر ویک اینڈ والا نمبر لے آیا۔ اس میں "دوستی اور واقفیت" کا صفحہ موجود تھا۔ ہم نے مل کر اسے پڑھنا شروع کیا اور مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ اس کالم میں مزاح کا خاصا مواد موجود تھا۔ اشتہارات کو پڑھتے ہوئے ہماری ہنسی روکے نہ رکتی تھی۔ بالآخر متعلقہ اشتہار مل گیا، جس کا متن یہ تھا:

" کامیاب تاجر، عمر پینتیس برس، قد ایک میٹر پچھتر، وزن اسی کلوگرام، آنکھوں کا رنگ نیلا،

ایک نوجوان لڑکی سے واقفیت پیدا کرنی چاہتا ہے، جو اس کی طرح ہر قسم کے پھندوں سے آزاد ہو اور وفاداری کو نبھانے اور قبول کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۴۹۔ ہمبرگ ۳۶"۔

"تم دیکھ سکتی ہو کہ سوائے پوسٹ بکس نمبر کے دوسری کوئی چیز اشتہار میں اور مجھ میں مشترک نہیں ہے ۔البتہ میں مشتہر کا شکر گذار ہوں، کیونکہ اس کے اشتہار کے سبب میری ملاقات تم سے ہو رہی ہے"۔ میں نے اس کا ردعمل دیکھنے کے لئے آخری فقرہ بڑھا دیا تھا۔

"میرے کوائف خط میں ٹھیک بیان ہوئے ہیں اور یہ تصویر بھی میرے دل کو لگتی ہے۔ مگر مجھے اتنی اچھی مصوری نہیں آتی"۔ ماریتا نے جواب دیا۔

ماریتا نے اپنی سہیلیوں کے نام گنوانے شروع کئے، جن میں سے شاید کسی نے اس کا روپ دھار کر خط لکھا تھا۔ وہ ایک ایک کا جائزہ لینے کے بعد خود ہی ان کا نام اپنی فہرست میں سے کاٹتی چلی گئی۔ آخر میں تین سابقہ کلاس فیلو سہیلیاں رہ گئیں، جن کے ساتھ ماریتا کی ایک زمانے میں گاڑھی چھنتی تھی۔ مگر ان کی چوکڑی عرصہ ہوا بکھر گئی تھی اور ماریتا نہیں جانتی تھی کہ اس کی سہیلیاں کہاں پر ہوتی ہیں اور کیا کرتی ہیں۔

اس نے بتایا کہ پڑھائی کے خاتمے پر چاروں کو الگ الگ فرموں میں اپرنٹس شپ ملی تھی، جس کے سبب ان کا روز روز کا ملنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس لئے یہ طے پایا کہ ہفتے کی شام کو ایک ریستوران میں ملا کریں، جہاں پر وہ ایک دوسرے کو مردوں کی بیوقوفی کے نت نئے لطیفے سنا کر خوب ہنسا کرتی تھیں۔ اس محفل میں کسی مرد کو شامل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ مگر یہ سلسلہ بھلا کب تک چل سکتا تھا اور وہ کب تک مجرد رہ سکتی تھیں۔ پہلے ایک کو مرد مل گیا اور وہ محفل سے غیر حاضر رہنے لگی۔ پھر دوسری اور تیسری ناغہ کرنے لگیں، جس کے پیچھے ان کے بوائے فرینڈز کا ہاتھ تھا۔ آخر کار ماریتا کا قصے کہانیوں والا شہزادہ آن نکلا۔ اس طرح ان کی چوکڑی بکھر گئی اور انہوں نے ایک دوسرے کو نظروں سے کھو دیا۔

مجھے ماریتا کے شہزادے کے بارے میں جاننے کا شوق تھا، مگر پہلی ہی ملاقات میں پوچھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ ذاتی معاملات کے بارے میں استفسار کرنا یوں بھی اچھا نہیں لگتا۔ اگر کوئی خود کچھ بتانا چاہے، تو دوسری بات ہے۔ مگر اس کے لئے وقت درکار ہوتا ہے، جب کہ مجھے یہ بھی یقین نہیں تھا کہ ہمارا دوسری بار ملنا ہوگا۔ ماریتا نے کہا وہ اس شام جلدی گھر واپس لوٹنا چاہتی ہے، کیونکہ اس روز ٹیلی ویژن پر اٹنبرگ کی مہاتما گاندھی کی زندگی پر بنائی ہوئی فلم آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ پھر ہمیں اپنی گفتگو اگلی ملاقات پر ملتوی کرنی پڑے گی۔ ماریتا نے میرا فون نمبر نوٹ کیا اور آئندہ دنوں میں کسی وقت رابطہ کرنے کا وعدہ

کیا۔گھر کی طرف ڈرائیو کرتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ ہم فلم اکھٹے بھی تو دیکھ سکتے تھے۔مگر ہوسکتا ہے کہ ماریتا نے اپنے قصے کہانیوں والے شہزادے یا کسی اور سے ملنا طے کر رکھا ہو۔

اگلے ہی روز ماریتا کا فون آ گیا اور اس نے مجھے گاندھی کی فلم کا دوسرا حصہ دیکھنے کے لئے، جو اسی شام کو دکھائی جانے والی تھی، اپنے فلیٹ پر آنے کی دعوت دی۔اس نے کہا کہ وہ گاندھی سے بہت مرعوب ہے اور اس کے بارے میں مزید جاننے کا شوق رکھتی ہے۔فلم کو دیکھ کر گاندھی اس کے لئے گوشت پوست کا فانی انسان بن گیا تھا اور دیومالائی کردار نہ رہا تھا۔میں نے جاننا چاہا کہ اس کو کب سے گاندھی میں دلچسپی ہے۔ ماریتا نے کہا کہ اسکول کے زمانے میں تاریخ حاضرہ کے سلسلہ میں ان کو ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے بارے میں بتایا گیا تھا۔دراصل ان کی استانی گاندھی کی چیلی تھی۔اس نے اس کی مثال پیش کر کے انہیں بتایا تھا کہ کس طرح انسان کمزور ہوتے ہوئے بھی طاقت وروں کا مقابلہ کرسکتا ہے۔چنانچہ جب مغربی جرمنی کی حکومت نے ایمرجنسی ایکٹ پارلمان میں پیش کیا، تو بائیں بازو کی جماعتوں نے اس کے خلاف تحریک چلائی، جس میں اسکول کے اسٹاف اور طالب علموں نے زور وشور سے حصہ لیا تھا۔وہ سڑکوں پر دھرنا مار کر بیٹھ جاتے تھے اور ٹریفک میں رکاوٹ ڈالنے کا باعث بنتے تھے۔ پولیس کے سپاہی انکو اٹھا کر سڑک سے ہٹاتے تھے، مگر بچے آنکھ بچا کر پھر سڑک پر جا بیٹھتے تھے۔ ماریتا نے کہا کہ وہ اور اس کی سہیلیاں اس چیز کو ایک کھیل تصور کرتی تھیں، مگر جب یونیورسٹی کے طالب علموں نے پولیس کا مقابلہ کرنا شروع کیا اور پولیس مظاہرین پر پانی کی دہار مارنے اور آنسو آور گیس کے گولے برسانے لگی، تو انہیں اندازہ ہوا کہ کھیل سنجیدگی کا روپ دھار چکا تھا۔انہی مظاہروں کے دوران اسکی ملاقات بلراج ملہوترا سے ہوئی تھی، جو ہندوستان کا رہنے والا تھا اور ہمبرگ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔

دنیا کتنی چھوٹی ہے۔میں بلراج کو جانتا تھا۔کیونکہ جب میں نے ہمبرگ یونیورسٹی میں داخلہ لیا، تو ایک محفل میں میرا اس کے ساتھ تعارف ہوا تھا۔وہ ان دنوں آخری سمسٹر میں تھا اور امتحان دینے کی تیاری کر رہا تھا۔دو ایک بار ہم کیفے ٹیریا میں ملے تھے اور اس نے کہا تھا کہ اس کے ماں باپ چاہتے ہیں کہ وہ امتحان دیتے ہی گھر لوٹ آئے۔اس پر میں نے مذاقاً کہا تھا کہ وہ پہنچتے ہی اس کی شادی رچا دیں گے۔اسے بھی یہی خطرہ تھا، کیونکہ وہ اپنے ماں باپ کا واحد بیٹا تھا، جو انہیں چار لڑکیوں کے بعد پرماتما نے ہردوار جا کر گنگا جل میں اشنان کرنے پر دیا تھا۔اس کے دوستوں نے مجھے بتایا تھا کہ بلراج کا معاشقہ ایک جرمن لڑکی کے ساتھ چل رہا تھا۔مگر اس کے ماں باپ بالکل نہیں چاہتے تھے کہ وہ کسی

یورپین بوزنی سے شادی کرے۔اس کی ماں نے دھمکی دی تھی کہ اگر بلراج نے انکی رضامندی کے بغیر شادی کی ،تو وہ کچھ کھا کر اپنی جان لے لے گی۔ اسکے بعد ہمارا ملنا نہیں ہوا ۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی تعلیم کے خاتمے پر ہندوستان واپس لوٹ گیا ہوگا۔اب ماریتا کے منہ سے اس کا نام سن کر مجھے اسکے بارے میں مزید جاننے کا شوق پیدا ہوا۔

میں نے دیکھا کہ بلراج کا ذکر آتے ہی ماریتا کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ پتہ چلا کہ دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ ٹوٹ کر محبت کی تھی۔ وہ بلراج کی خاطر ،جس کے ماں باپ بہت مذہبی تھے، ہندومت اختیار کرنے کے لئے تیار ہوگئی تھی، کیونکہ وہ اپنے بیٹے کو کسی قیمت پر ہاتھ سے نہیں کھونا چاہتے تھے۔ادھر ماریتا کا تعلق ایک کیتھولک فیملی سے تھا، جس کا چرچ غیر مذہب والوں سے شادی بیاہ کرنے کی اس زمانے میں بالکل اجازت نہ دیتا تھا۔ماریتا نے کہا کہ وہ اس صورت میں چرچ کو چھوڑنے اور ماں باپ کی ناراضگی کو مول لینے کے لئے تیار تھی۔مگر اس کی نوبت نہ آئی۔اس کی باتوں سے البتہ میں نے اندازہ لگایا کہ بلراج کے ساتھ اس کی دوستی ماضی کا حصہ بن چکی تھی۔ ماریتا کے دل پر اس بات کا زخم بہت گہرا تھا۔

ماریتا کا فلیٹ دو کمروں پر مشتمل تھا۔فرنیچر کچھ ایسا زیادہ نہ تھا۔بس ایک صوفہ سیٹ ،میز، کتابوں کو رکھنے کے لئے ریک ، کمرے کے ایک کونے میں ٹیلی ویژن سیٹ، مشینی قالین ،جن کا اس زمانے میں عام رواج تھا۔کھڑکی پر کاٹن کا جالی دار پردہ، دیوار پر تین چار تصویریں۔اس سے زیادہ ڈیکوریشن مجھے دکھائی نہ دی۔فلیٹ کچھ اجاڑ سا لگ رہا تھا۔جیسے کچھ سامان کوئی اٹھا کر لے گیا ہو۔مجھے پتہ تھا کہ مجھے اس بارے میں کچھ پوچھنے کا حق نہ تھا۔

ماریتا کسی میڈیکل لیبارٹری میں ریسرچ اسٹنٹ تھی، جہاں پر اس کا واسطہ سائنس دانوں کے ساتھ ہر روز پڑتا تھا۔مگر وہ لوگ اس کی نظر میں تجربات کے لئے استعمال ہونے والے مادے کی طرح ٹھنڈے ٹھار تھے۔ان کے مقابلے میں بلراج ایک ابلتا ہوا لاوا تھا۔جس کی حدت نے ماریتا میں زندگی کے لئے ایک نیا ولولہ پیدا کر دیا تھا۔ وہ اس کی خاطر دنیا کے کسی بھی کونے تک جانے کو تیار تھی، مگر ہندوستان جانا اس کی قسمت میں نہ لکھا تھا۔میں نے کہا لاکھوں ٹورسٹ ہر سال اس ملک جاتے ہیں۔ اس کے راستے میں بھلا کیا رکاوٹ ہے۔ ماریتا نے کہا کہ وہ بلراج کے ساتھ ہندوستان جانا چاہتی تھی ،اس کی بہنوں اور ماں باپ سے ملنا چاہتی تھی۔مگر ان لوگوں نے اس کو قبول نہیں کیا تھا۔اسے دیکھے اور ملے بغیر رد کر دیا تھا۔

"بلراج کے ساتھ میری منگنی بھی ہو چکی تھی"۔ ماریتا نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا: "میرے ماں باپ نے میری ہٹ دھرمی کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ مگر بلراج نے ہماری منگنی کو اپنے خاندان سے چھپائے رکھا۔ میں نے بلراج کی خاطر یہ فلیٹ کرائے پر لیا تھا، تاکہ وہ آزادی کے ساتھ میرے ہاں آ جا سکے۔ پھر وہ یہیں پر اٹھ آیا۔ اسے یونیورسٹی سے ڈگری ملنے کے بعد ایک معقول ملازمت مل گئی تھی اور ہم نے شادی کی تاریخ بھی طے کر لی تھی۔ اس کو اپنے وطن سے بس ایک سرٹیفکیٹ حاصل کر کے پیش کرنا تھا کہ وہ پہلے سے شادی شدہ نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی اس سلسلہ کی کوششوں کی ماں باپ کے کانوں میں بھنک پڑ گئی ہو، کیونکہ ایک روز اس کے باپو کا ٹیلیگرام ملا کہ ماتا جی سخت بیمار ہیں اور مرنے سے پہلے تم کو آخری بار دیکھنا چاہتی ہیں"۔

"مجھے پتہ ہے کہ وہاں پر ہندوستان میں بلراج کے ساتھ کیا ہوا ہوگا"۔ میں نے لقمہ دیا۔ "ماں کی بیماری شاید بہانہ ہوگی۔ وہ لوگ بلراج کی شادی کا سارا انتظام کئے بیٹھے ہوں گے اور جاتے ہی اس کی منگنی کر دی گئی ہوگی اور واپسی سے پہلے شادی اور رخصتی عمل میں آ گئی ہوگی"۔

"عین یہی کچھ ہوا تھا، مگر مجھے بہت دیر کے بعد جا کر پتہ چلا۔ بلراج نے مجھ سے یہ بات ہندوستان سے واپس لوٹنے کے بعد پورے چھ ماہ تک چھپائے رکھی۔ اس کا راز اس طرح کھلا کہ میں نے ماتا جی کے لئے ایک ہار بلراج کو بتائے بغیر ڈاک سے بھیج دیا۔ اس پارسل نے قیامت ڈھا دی۔ اس کی بیوی نے دیکھا کہ پتہ وہی ہے، جس پر وہ بلراج کو خط لکھا کرتی تھی۔ البتہ بلراج نے اسے اپنے دفتر کا فون نمبر دے رکھا تھا۔ میرے چھپے ہوئے لیٹر پیڈ پر گھر کا فون نمبر درج تھا۔ سوشیتا نے اٹھ کے مجھے فون کر دیا اور بتایا کہ وہ بلراج کی بیاہتا بیوی ہے اور بہت جلد اس کا بچہ جننے والی ہے۔ واضح ہے کہ میرے لئے اب اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا کہ اپنے دل پر پتھر رکھ کر بلراج سے علیحدگی اختیار کروں"۔

"بلراج اب کہاں پر ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرے ساتھ اس کا کوئی رابطہ نہیں رہا۔ وہ اس شہر کو چھوڑ گیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے جرمنی کو بھی خیر باد کہہ دیا ہو" ماریتا نے جواب دیا۔

"کیا تم اب بھی اس سے محبت کرتی ہو؟"

"میں اس سے انکار نہیں کرتی، کیونکہ جب سے وہ گیا ہے میں کسی اور کو اپنے دل میں بسا نہیں سکی۔ شاید میرے اندر کی عورت مر گئی ہے اور میں اس کا ڈھانچہ اٹھائے ہوئے پھرتی ہوں۔ بعض اوقات میں مر جانا چاہتی ہوں۔ پھر سوچتی ہوں کہ بلراج کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اس نے شادی اپنی مرضی سے نہیں

کی تھی، اس کے ساتھ جبر کیا گیا تھا۔ مگر اس نے یہ بات مجھے خود کیوں نہ بتائی۔ خاموشی کے ساتھ میری غیر حاضری میں اپنا سامان اٹھا کے چلتا بنا۔ ایک الوداعی خط تک نہ چھوڑا۔ وہ یوں میری زندگی سے نکل گیا، جیسے کبھی اس کا حصہ نہیں رہا تھا"۔ ماریتا کی آواز جذبات کے اتھل پتھل کے سبب لرز رہی تھی۔

پتہ چلا کہ بلراج سے علیحدگی پر تین سال ہو گئے تھے۔ اس عرصہ میں ماریتا نے اس کو بھلانے کی بہت کوشش کی تھی، مگر ناکام رہی تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ اس دوران میں درجن بھر مردوں سے ملی تھی، جو محض ایک آدھ رات اس کے ساتھ سونے کے خواہش مند تھے یا زیادہ سے زیادہ اس کو اپنی باندی بنا کر رکھنا چاہتے تھے۔ دو چار ان میں سے ایسے بھی تھے، جو یہ چاہتے تھے کہ ماریتا کمائے اور وہ عیش کریں۔ اس صورت حال سے تنگ آ کر اس نے مردوں سے ملنا چھوڑ دیا تھا، بلکہ بعض اوقات سوچا کرتی تھی کہ اپنی بڑی بہن کی طرح راہبہ بن جائے، جو ایک عمر سے ایک مونسٹری میں رہتی تھی۔ اس بہن سے ملنے کے لئے وہ کبھی کبھی وہاں پر جایا کرتی تھی۔ مگر اسے پتہ تھا کہ وہ اس قسم کی زندگی کے لئے موزوں نہیں تھی۔

میں نے کہا کہ دنیا بلراجوں سے بھری پڑی ہے اور اس جیسی خوبصورت عورت کو دنیا سے کنارہ کشی نہ کرنی چاہیئے۔ ایک نہ ایک روز اس کی قسمت جاگے گی اور ایک نیا بلراج اس کے دروازے پر دستک دے گا۔

"پتہ نہیں وہ دن کب آئے گا۔ مجھے یوں لگتا ہے، جیسے میری زندگی بلا مصرف گذر رہی ہے۔ بعض اوقات پورا پورا ہفتہ بیت جاتا ہے پیشتر اس کے کہ کوئی مجھے فون کرے اور میرے ساتھ کسی ریستوران یا میوزک کانسرٹ میں جانے کی خواہش کا اظہار کرے"۔ ماریتا کی آنکھوں میں بے چارگی کی لہر تھی۔

"کیا میرا فون ایک ایسے وقت پر آیا تھا؟" میں نے شرارت سے پوچھا۔

"ہاں یہی بات تھی۔ میں اتوار کے روز سچ مچ یہ فیصلہ کر کے ٹیلی ویژن ٹاور پر گئی تھی کہ اس کے اوپر بنے ہوئے ویو پوائنٹ سے چھلانگ لگا کر اپنی زندگی کو ختم کر دوں گی۔ مگر وہاں پر اتنے بے شمار لوگ تھے اور ایک مضبوط آہنی جنگلا لگا ہوا ہے۔ پھر اس کے گرد شیشے کا خول بنا ہوا ہے، جس کو انسان کھول نہیں سکتا اور نہ نیچے کود سکتا ہے۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں وہاں سے کس قدر مایوس گھر لوٹی تھی"۔

میں ماریتا کی بات سن کر کانپ گیا۔ مجھے گمان تک نہ تھا کہ وہ ایسی ذہنی کشمکش کا شکار تھی۔ میرا واسطہ اس سے قبل کبھی ایسی صورت حال سے نہ پڑا تھا، اس لئے کچھ سوجھتا نہ تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

اس عرصہ میں اس کا ہاتھ، جو برف کی طرح یخ تھا، جیسے خود بخود میرے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ میں نے اپنا بازو اس کے کندھے پر رکھا، تو وہ پکے ہوئے آم کی طرح میری گود میں آ گری۔ واضح ہے کہ گاندھی کی فلم اس روز ہم سے نہ دیکھی گئی۔ میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ ہم اس قدر جلد ایک دوسرے کے اتنے قریب آ جائیں گے۔

آئندہ دنوں اور ہفتوں میں ماریتا میرا سایہ بن گئی، جو راتوں کو بھی کم ہی جدا ہوتا تھا۔ مگر ہم دونوں جانتے تھے کہ ہمارا ساتھ محدود وقت کے لئے تھا۔ یہ بات ماریتا کو قبول تھی۔ اسے بہت دنوں کے بعد ایک شخص ملا تھا، جو اس کی باتیں توجہ سے سنتا اور ان کو اہمیت دیتا تھا۔ میں نے اسے اس کے خول سے باہر نکالا۔ اسے گرد و نواح کے حسین مناظر کی سیر کرائی۔ سینما، تھیٹر اور میوزک ہال میں لے گیا، جہاں پر اس معاشرے کا دل دھڑکتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کے اندر چھپی ہوئی چھلبلی لڑکی جاگ اٹھی اور اس کے حسن کو چار چاند لگ گئے تھے۔ مجھے پتہ تھا کہ اب یہ چڑیا بہت دنوں تک میرے قبضے میں نہ رہے گی۔ میں اس دن کے لئے تیار تھا، جب وہ ایک روز مجھے کہے گی کہ اس کو ایک نیا بلراج مل گیا ہے۔ جس کے ساتھ وہ زندگی گذارنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

اس دوران میں مجھے چند ہفتوں کے لئے ایک سفر پر ملک سے باہر جانا پڑا۔ جب میں واپس لوٹا، تو ماریتا نے فون پر کہا کہ مجھے ایک خبر سننے کے لئے ذہنی طور پر تیار رہنا چاہیئے، جس کا تعلق اس کی آئندہ زندگی سے ہے۔ پتہ چلا کہ میری غیر حاضری میں اس کا تعارف ایک جرمن انجنیئر کے ساتھ ہوا تھا، جو بلراج تو نہیں تھا، مگر اس سے کم بھی نہیں تھا۔ اس نے خود ہی شادی کی بات کی تھی اور اب ماریتا کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔

"تمہارا جواب کیا ہے" میں نے پوچھا۔

"پیٹر مجھے اچھا لگتا ہے اور میں اسے دل و جان سے چاہتی ہوں۔ مگر میرا خیال تھا کہ تم اس کو ایک نظر دیکھ کر مجھے مشورہ دو"۔ ماریتا نے کہا۔

"پیاری ماریتا میں تمہارا سرپرست نہیں ہوں، جو ایسے معاملات میں دخل دیتا پھروں۔ یہ فیصلہ تم کو خود کرنا ہوگا۔ اگر کل کو معاملہ بگڑ گیا، تو میں نہیں چاہتا کہ الزام میرے سر پر لگے۔ تم کو اس کے ساتھ زندگی بتانی ہوگی نہ کہ مجھے"۔ میرا جواب اسے یقیناً روکھا لگا ہوگا۔

تین ماہ کی کورٹ شپ کے بعد ان کی شادی ہوگئی۔ پیٹر کو اس کی جلدی تھی، کیونکہ وہ ترقی پا کر ایک نئی پوسٹ پر کولون منتقل ہو رہا تھا۔ روانگی سے ایک روز پہلے ماریتا مجھ سے رخصت لینے کے لئے آئی

۔ میں نے چلتے وقت کہا کہ مزہ تو تب ہے، جب ہم تیس برسوں کے بعد پھر ایک بار آج کے روز ملیں اور ایک دوسرے کو بتائیں کہ زندگی نے ہمارے ساتھ کیا برتاؤ کیا تھا۔ میں نے یہ بات لمحاتی تحریک پر غور و فکر کے بغیر بس یونہی کہہ دی تھی۔ کون جانے اتنے برسوں میں ہم کہاں ہوں گے اور ہمارے حالات کیا ہوں گے۔ مگر لگتا تھا کہ ماریتا نے اس بات کو سنجیدگی سے لیا تھا، کیونکہ اس نے کہا کہ وہ ضرور مجھے ملنے کے لئے آئے گی، خواہ میں دنیا کے کسی بھی کونے میں کیوں نہ ہوا۔

اب وہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کے سر کے بال بھی میری طرح چٹے ہوں گے۔ میرے تو خیر آدھے سے زیادہ جھڑ چکے تھے۔ مگر اسکے سر پر بال بدستور گھنے تھے۔ اس نے ہیر ڈائی کرا رکھی تھی۔ جسم اس کا ابھی تک چھریرا تھا، قد کاٹھ ویسا ہی تھا۔ ایک خوبصورت عورت۔ میں نے نہ صرف دل میں داد دی، بلکہ یہ بات اس سے کہہ دی۔

"جانتے ہو کہ میں دو بیٹوں اور ایک بچی کی ماں ہوں۔ بڑا بیٹا انتیس برس کا ہے اور آج کل امریکہ میں ایک کمپیوٹر فرم کا مینجر ہے۔ دوسرا بیٹا میڈیکل ڈاکٹر ہے۔ بچی ان سے بہت چھوٹی ہے اور پچھلے سال یونیورسٹی میں داخل ہوئی ہے"۔ ماریتا اپنے بچوں پر فخر مند تھی اور اس کے لہجہ سے خود اعتمادی جھلک رہی تھی۔

وہ اپنی زندگی سے خوش لگتی تھی۔ پیٹر تھوڑے دنوں میں پنشن لینے والا تھا۔ انہوں نے مکان بنایا تھا، پودے لگائے تھے۔ پیٹر ساری عمر اپنے پیشے میں اس طرح مصروف رہا تھا کہ انہیں بہت کم سیر وسفر کا موقعہ ملا تھا۔ اب وہ دور دراز ملکوں کی سیاحت کا پروگرام بنا رہے تھے۔ دونوں صحت مند تھے اور بچوں کی طرف سے ان پر کوئی ذمہ داری نہ رہی تھی۔

"تو گویا تم نے بہت اطمینان کی زندگی گذاری ہے۔ کیا کبھی بلراج کی یاد بھی آئی؟" میں یہ سوال پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"بلراج کو میں بھول نہیں سکتی، کیونکہ وہ میری پہلی محبت تھی۔ مگر میں اسے معاف بھی نہیں کر سکتی، کیونکہ اس نے مجھے حمل گرانے پر مجبور کیا تھا۔ اگر وہ بچہ زندہ ہوتا، تو اب پینتیس برس کا ہوتا"۔

"یہ بات تم نے مجھے اس وقت نہیں بتائی تھی"۔ میں نے اس بارے میں اپنی بے خبری کا اقرار کرنے کے لئے کہا۔

"کیونکہ مجھے یقین نہیں تھا کہ تمہارا ردعمل کیا ہوگا۔ تم نے مجھے زندہ رہنے کا حوصلہ دیا تھا اور کہا تھا کہ رات کا دورانیہ ہمیشہ کے لئے نہیں ہوتا۔ اس کے خاتمے پر سورج بھی چڑھتا ہے"۔

"اچھا یہ بات میں نے کہی تھی؟" مجھے اعتبار نہیں آ رہا تھا کہ میں تیس برس قبل اتنا سمجھ دار ہوا کرتا تھا۔" کیا تم نے سراغ لگایا تھا کہ کس نے تمہاری جگہ پر اشتہار کے جواب میں خط لکھا تھا؟"

"خط کس نے لکھنا تھا۔ میں نے خود لکھا تھا"۔ ماریتا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بالکل اسی طرح جیسے اشتہار خود میں نے چھپوایا تھا"۔ میں نے نہلے پر دھلہ مارا۔

(کمرفیلڈ۔ ۲۵ فروری ۲۰۰۰ء)

بچھڑی ہوئی کونج

بوڑھا تو خیر بوڑھا تھا، جیسے سینکڑوں دوسرے بوڑھے۔ اگر اس کے پہلو میں وہ عورت نہ ہوتی، جو ہزاروں میں ایک تھی، تو وہ یقیناً میری توجہ کا مرکز نہ بنتا۔ بوڑھا ستر سے اوپر تھا، جبکہ عورت تیس پینتیس سال سے زیادہ عمر کی نہ تھی۔ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ اس کی کیا لگتی ہے، بیوی، داشتہ یا شاید بیٹی۔ وہ اس کی کچھ بھی لگتی ہو، میں نے دل میں سوچا، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اہم بات تو یہ تھی کہ وہ اس گروپ میں شامل تھی، جو سویٹ یونین کی سیاحت کو جا رہا تھا۔

میں ہوائی اڈے کی لاؤنج میں خاص طور پر ان کے پہلو میں جا کر بیٹھا۔ بوڑھے نے تعارف ہوتے ہی اپنے سابقہ سفروں کی داستانیں سنانی شروع کر دیں۔ لگتا تھا کہ وہ اچھا خاصا تجربہ کار سیاح تھا۔ وہ سویٹ یونین کو، جہاں پر وہ پندرہ بار جا چکا تھا، اپنی واسکٹ کی جیبوں کی طرح جانتا تھا۔ البتہ روسی ترکستان وہ پہلی بار جا رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ اس کو وہاں پر جرمن قومیت کے لوگوں سے ملنے کا موقعہ ملے گا، جو صدیوں سے روس میں بستے ہیں، مگر آج تک جرمن رسوم و رواج کو اپنائے ہوئے ہیں اور آپ میں بدستور جرمن زبان بولتے ہیں۔ وہ ان سے اپنے سابقہ سفروں کے دوران سویٹ یونین کے مختلف علاقوں میں مل چکا تھا۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا: "جرمنوں سے ملنے کے لئے سویٹ یونین جانے کی کیا ضرورت ہے۔ آدمی ان سے اپنے شہر میں رہتے ہوئے دن رات مل سکتا ہے۔ پھر ان میں کوئی ایسی خوبی نہیں پائی جاتی کہ انسان ان کو ساری دنیا میں تلاش کرتا پھرے"۔

بوڑھے نے، جو روسی ترکستان کا نقشہ کھولے ہوئے بیٹھا تھا، مجھے عینک کے اوپر سے دیکھتے ہوئے کہا: "نوجوان کبھی بچھڑی ہوئی کونج کی کہانی سنی ہے، جو اپنے بھائی بندوں کو ڈھنڈتی پھرتی ہے؟"

"ضرور سنی ہے، بلکہ میں خود بھی ایک بچھڑی ہوئی کونج ہوں"۔ میں نے جواب دیا۔

بوڑھے کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اس نے میری طرف مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھایا اور مجھے خوش آمدید کہا۔ اس کی ساتھی عورت نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کہا کہ وہ بھی ایک بچھڑی ہوئی کونج ہے، مگر اپنے باپ کے برعکس جرمن آبادکاروں کا سراغ لگانے کیلئے نہیں جا رہی۔ وہ خود اپنی تلاش میں

سرگرداں ہے۔

ہوائی جہاز میں ہلڈے اپنے باپ نوربرٹ اور میرے درمیان بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ پہلی بار سویٹ یونین جارہی تھی۔ مگر اپنے باپ کی زبانی وہاں کے بارے میں بہت کچھ سن چکی تھی۔ کمیونزم اس کے نزدیک سات مہریں لگے ہوئے بستے کی طرح تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے، جب گورباچوف نیا نیا کمیونسٹ پارٹی کا جنرل سیکرٹری بنا تھا اور گلاسنوسٹ اور پروسٹرویکا کی پالیسی کا چرچا اخباروں میں ہونے لگا تھا اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ سویٹ یونین میں کیا ہونے والا ہے۔

نوربرٹ کا خیال تھا کہ سویٹ یونین میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ اس کی مثال اس بڈھی فحبہ عورت کی ہے، جو نیا میک اپ لگا کر سمجھتی ہے کہ گاہک کو اس کی جھریاں نظر نہیں آئیں گی، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی لٹکتی ہوئی چھاتیاں اور ڈھلکا ہوا پیٹ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس نے کہا گورباچوف مچھلی کے چالاک بیوپاری کی طرح ہے، جو اپنے سڑاندزدہ مال کو اپنی لچھے دار باتوں کے زور پر بیچنا چاہتا ہے۔

میں نے کہا: " گورباچوف وقت کی آواز ہے۔ اگر وہ ازخود پیدا نہ ہوتا، تو چاہیئے تھا کہ اس کو ایجاد کیا جاتا"۔

نوربرٹ نے جواب دیا: " کمیونزم ایک عرصہ سے جانکنی کے عالم میں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ گورباچوف اس مردے میں پھر سے جان ڈال دے"۔

مجھے یاد آیا کہ نطشے نے مارٹن لوتھر کے بارے میں کہا تھا کہ اس پادری کے بچونگڑے نے پروٹسٹنٹ تحریک کا چکر نہ چلایا ہوتا، تو روم کے پوپ کبھی کے عیسائیت کا گلا گھونٹ چکے ہوتے۔

اس دوران میں ہمارا طیارہ ماسکو کے ہوائی اڈے پر اترنے کے لئے بادلوں کی دبیز تہوں کو چیرتا ہوا نیچے آیا۔ ماسکو ہمارے قدموں میں پڑا تھا اور اس کے گرد دور دور تک پھیلے ہوئے درختوں کے سرخی اور زردی پکڑنے والے پتوں نے ایک سماں باندھ رکھا تھا۔ موسم خزاں اپنے جوبن پر تھا۔

ہمیں بیلگراڈ ہوٹل میں ٹھہرایا گیا، جو شہر کے عین وسط میں واقع ہے۔ ہمارے کمرے انیسویں منزل پر پہلو بہ پہلو تھے۔ وہاں سے شہر کا نظارہ بے حد دلکش تھا۔ یوں لگتا تھا، جیسے ہم ماسکو کی چھت پر بیٹھے ہوئے نیچے سڑک پر رینگنے والی چیونٹیوں کو دیکھ رہے ہوں۔ نوربرٹ تھک گیا تھا اور شام کے کھانے کے بعد آرام کرنا چاہتا تھا۔ ہلڈے ماسکو کی شام کو سو کر نہ گنوانا چاہتی تھی۔ اس نے میرے ساتھ ارباط اسٹریٹ جانے کا پروگرام بنالیا، جہاں پر روسی آرٹسٹ شام کے وقت اپنی تصویریں اور دوسرے فنکار اپنے اپنے فن کے نمونے بیچتے ہیں۔ میں ایک سابقہ سفر کے دوران وہاں پر جاچکا تھا اور جانتا تھا کہ وہاں

پرٹورسٹوں کے لئے دلچسپی کا خاصا سامان پایا جاتا تھا۔

ہم ہوٹل سے باہر نکلے، تو ٹھنڈی ہوا نے ہمارا استقبال کیا۔ ہم گرم کوٹ پہنے ہوئے تھے، مگر داستانوں کے بغیر اور ننگے سر تھے۔ میں نے ہلڈے سے کہا کہ ارباط اسٹریٹ کے آس پاس بار اور کیفے پائے جاتے ہیں، جہاں پر ہم اپنی روحوں کو گرم کر سکیں گے۔ اس نے اپنا بازو میرے بازو میں ڈال دیا، جیسے کہہ رہی ہو کہ اس طرح بھی تو ہم ایک دوسرے کو گرم رکھ سکتے ہیں۔ اس پر مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

ہلڈے کسی آفس میں سیکریٹری تھی، جب کہ اس کا باپ اچھا خاصا بیوپاری تھا، جسکی بوٹوں کی دوکان خوب چلتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ہلڈے اسکے بعد کاروبار کو سنبھالے، مگر اسے یہ سودا بہت مہنگا لگتا تھا اور وہ کسی قیمت پر اس کام کیلئے تیار نہ تھی۔ اس نے بچپن سے دیکھا تھا کہ ماں باپ ہفتے کے سات روز صبح سے شام تک دوکان کے دھندے میں مصروف رہتے تھے۔ ماں نے ساری عمر کبھی چھٹیاں نہ منائی تھیں۔ البتہ اس کا باپ سال میں دو تین ہفتے روس کی سیاحت کیلئے ضرور نکال لیا کرتا تھا۔

میں نے پھر ایک بار اپنی حیرت کا اظہار کیا اور پوچھا کہ کیا اس کے باپ کو دنیا کے نقشے پر اس ملک کے سوا اور کوئی ملک دکھائی نہیں دیتا۔

ہلڈے نے کہا کہ اس کا باپ اس بارے میں اپنے ساتھ بحث نہیں کرنے دیتا۔ وہ پہلی بار اس کے ہمراہ سفر پر نکلی تھی اور وہ بھی اس وجہ سے کہ اس نے سات برسوں کی شادی کے بعد اپنے خاوند سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا کہ ساتویں منحوس سال والی بات درست لگتی ہے۔ اسکا باپ اپنے داماد کو پسند نہیں کرتا تھا۔ جب ہلڈے نے طلاق حاصل کرنے کیلئے عدالت کی طرف رجوع کیا، تو باپ نے خوش ہو کر اسے روسی ترکستان کی سیر کیلئے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔

ہلڈے کے بچے نہیں تھے۔ دراصل اس کا خاوند فرانز بچے نہیں چاہتا تھا۔ اس نے شروع میں ہی کہہ دیا تھا کہ وہ بچوں کو پسند نہیں کرتا، کیونکہ ان کی وجہ سے انسان آزادی کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ پھر بچوں کے ہوتے ہوئے ان کے لئے اپنی زندگی کے اونچے اسٹینڈرڈ کو برقرار رکھنا ممکن نہ ہوتا۔ انہوں نے دو کاریں رکھی ہوئی تھیں، رہائشی فلیٹ خرید رکھا تھا اور ایک صحت افزا مقام پر ان کی کیمپنگ دین کھڑی تھی، جہاں پر اکثر ان کا ویک اینڈ گذرتا تھا۔ سردیوں میں بھی موسم خوشگوار ہوتا تھا، تو وہ وہاں پر چلے جاتے تھے۔ وین میں ہیٹنگ لگی ہوئی تھی۔ سالانہ تعطیلات وہ بلاناغہ کسی غیر ملک میں منانے جاتے تھے۔

انکے ملنے ملانے والے، دوست یار، کولیگ بہت تھے، جنکے ساتھ مل کر وہ تہوار اور برتھ ڈے پارٹیاں مناتے تھے۔ مگر اسکا خاوند دراصل اپنے دل کی گہرائیوں سے کسی کے ساتھ دوستی کے تعلقات نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اور ہمیشہ سے ان کی ساری محبت اور توجہ کا مرکز رہا تھا۔ وہ ہلڈے سے بھی ویسی ہی محبت چاہتا تھا۔ وہ اس بات کو گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ ہلڈے اپنے ماں باپ یا کسی اور کو اس پر ترجیح دے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس کا دوسروں پر حسد بیماری کی حد تک بڑھ گیا تھا۔ ہلڈے اس کی موجودگی میں اپنی کسی سہیلی سے بات تک نہ کر سکتی تھی۔ پھر اگر اتفاق سے کسی کا فون آ جاتا تھا، تو قیامت ٹوٹ پڑتی تھی۔ فرانز کو ہمیشہ سے شبہ تھا کہ ہلڈے اس سے چھپ چھپا کر اپنے عاشقوں سے ملتی تھی۔ جب روز روز کے جھگڑے شدت اختیار کر گئے، تو ہلڈے نے طلاق لینے کا تہیہ کر لیا۔ پھر ایک روز وہ فرانز کی گھر سے غیر موجودگی میں اپنا سامان اٹھا کر چلی گئی اور اس سے اگلے روز اس کے وکیل کا خط فرانز کو ملا، جس کے ذریعہ طلاق کی کاروائی کا آغاز ہوا۔

آدھی رات کو ہم ہوٹل میں واپس لوٹے، تو میں ہلڈے کی زندگی کی کہانی سے خوب واقف ہو چکا تھا۔ شاید وہ اپنے دل کا بوجھ اتارنا اور مجھے اپنا ہمراز بنانا چاہتی تھی۔ مجھے حیرت ضرور ہوئی کہ اس نے جرمنوں کی روایت کے برخلاف ہر بات کھل کر بیان کر دی تھی، جبکہ ہمارا تعارف ہوئے ابھی ایک پورا دن بھی نہ گذرا تھا۔

اگلی صبح ہمارا گروپ ماسکو کی سیر کے لئے نکلا، جس کے دوران ریڈ اسکوائر اور کرملین کی زیارت کی گئی۔ ایک باغ میں ہم نے پشکین، ٹالسٹائی اور گوگول کے مجسمے دیکھے۔ ہلڈے کو ٹالسٹائی کا مجسمہ پسند آیا، جو ایک باغ کے سرے پر بیٹھا ہوا کوئی کہانی تخلیق کرنے میں مصروف لگتا تھا۔ پشکین کے قدموں میں تازہ پھولوں کی نذر چڑھائی گئی تھی۔ روسی اپنی زبان سے بہت پیار کرتے ہیں اور ادیبوں اور شاعروں سے والہانہ محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ ہم نے پشکین میوزیم بھی دیکھا۔ مجھے بالخصوص مصری حصے کو دیکھنے کا شوق تھا۔ وہاں پر رکھی ہوئی ممیاں اور دوسرے مجسمات اصلی ہیں، جبکہ میسوپوٹامیا اور دوسری تہذیبوں والے حصے میں نقلیں رکھی ہوئی ہیں۔

نوربرٹ اس روز ہمارے ساتھ نہیں گیا تھا۔ وہ ماسکو سے خوب واقف تھا اور صبح سویرے جرمنوں کی تلاش میں نکل گیا تھا۔ ہلڈے دنیا جہان کی سیاحت کر چکی تھی، البتہ روس وہ پہلی بار آئی تھی اور اپنے سوالوں سے روسی گائیڈ یلینا کے پیٹ میں سوراخ کر رہی تھی۔ اس کو یہ جاننے کا شوق تھا کہ روسیوں کا رہن سہن کیسا ہے اور ان کو رہائشی فلیٹوں کے لئے اپنی ماہوار تنخواہ میں سے کتنا حصہ بطور کرایہ دینا ہوتا

ہے۔اس کو بالکل اعتبار نہ آیا، جب یلینا نے بتایا کہ ماسکو کے باسیوں کو ایک مربع میٹر رہائشی رقبہ کے لئے ماہوار چودہ کوپیک، گویا چودہ آنے، ادا کرنے پڑتے ہیں اور وہ بھی صرف سونے والے کمروں کی پیمائش کے حساب سے۔کوریڈور، باتھ روم، کچن اور دوسرے سروس کے کمرے کرائے سے آزاد ہیں۔ یلینا نے بتایا کہ پچاس لاکھ روسی یہ معمولی رقم بھی ادا نہیں کرتے اور ملک میں کوئی قانون نہیں پایا جاتا، جس کے ذریعے ان کو کرایہ ادا کرنے پر مجبور کیا جا سکے۔ ہلڈے نے کہا کہ اس کی ماہوار آمدن کا ایک تہائی حصہ فلیٹ کے کرائے پر اٹھ جاتا ہے۔یلینا نے جواب دیا: تمہارے مکان میں ہر چیز اپنی جگہ پر ہو گی۔ ہیٹنگ کام کرتی ہو گی اور ایلیویٹر چلتا ہو گا، جب کہ اس کے مکان میں پندرہ برسوں سے کسی قسم کی مرمت نہیں ہوئی۔

ہلڈے یوں تو ایک جہان دیدہ عورت تھی، مگر اس کی باتوں سے معصومیت ٹپکتی تھی۔ جب وہ روسی عورتوں کو ٹریکٹر، بسیں اور ریل گاڑیاں چلاتے ہوئے دیکھتی تھی، تو اس کا منہ یوں کھلا رہ جاتا تھا، جیسے روسی عورتیں کسی دوسرے سیارے سے اتری ہوں۔ وہ ان کے کھردرے ہاتھوں کو تکتی تھی، تو اپنی نرم اور گداز ہتھیلیوں کو کھول کر بیٹھ جاتی تھی۔ان کے لانگ بوٹوں کا اپنے سینڈلوں سے مقابلہ کرتی تھی اور اس نتیجہ پر پہنچتی تھی کہ کمیونزم نے عورتوں کو سخت جان بنا دیا ہے اور ان کو ان کے قدرتی حسن سے محروم کر دیا ہے۔

شام کو ہم ہوٹل میں واپس لوٹے، تو ہماری نئی گائیڈ کاتھیرینا آئی ہوئی تھی، جسے ماسکو سے روانگی کے بعد سارے سفر کے دوران ہمارے ساتھ رہنا تھا۔ وہ نسوانی حسن کا نمونہ تھی۔اس کی موجودگی میں ہلڈے کی خوبصورتی ماند سی پڑ گئی تھی۔نوربرٹ ایک واقف کار سے مل کر آیا تھا اور اس سے تاشقند میں بسنے والے کسی جرمن خاندان کا پتہ لایا تھا۔ وہ بہت خوش تھا، جیسے اسے کوئی خزانہ مل گیا ہو۔اس کے پاؤں زمین پر ٹکتے ہی نہ تھے۔

اس شام ہمارا پروگرام باہر جانے کا نہیں تھا، کیونکہ ہمیں اگلی صبح بہت سویرے سفر پر روانہ ہونا تھا۔کاتھیرینا نے خاص طور پر کہا تھا کہ وقت کی پابندی بہت ضروری ہے، کیونکہ ائرپورٹ جانے میں بہت سا وقت لگے گا اور ہوائی جہاز کسی کا انتظار نہیں کرے گا۔مگر اس شام نوربرٹ اتنی جلدی سونے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔اس نے ہمیں ہوٹل کی بار میں چلنے کو کہا۔ ہلڈے نے بار میں جانے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ ہم نے دن کے دوران سڑکوں پر اور اسٹوروں کے دروازوں پر روسیوں کو ووڈکا کی بوتلیں منہ سے لگائے ہوئے اور بے شمار لوگوں کو نشے میں مدہوش زمین پر پڑے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ نظارہ

دیکھنے کے لئے اسے ماسکو آنے کی حاجت نہ تھی۔ وہ اسے اپنے وطن میں دیکھ سکتی تھی۔

اس پر میں نے انہیں اپنے کمرے میں آنے کی دعوت دی، جہاں پر ہر قسم کی مشروبات موجود تھیں۔ میں نے کہا کہ اگر نوربرٹ ان سے سیر نہ ہوا، تو ووڈکا کی ایک بڑی بوتل روم سروس کو آرڈر دے کر منگائی جاسکتی ہے۔ نوربرٹ نے بیرے کو ووڈکا کی ایک بڑی بوتل لانے کو کہا۔ میں روسی زبان تو نہیں جانتا، مگر نوربرٹ کے لب ولہجہ کو سن کر اور اس سہولت کو دیکھ کر، جس سے وہ روسی زبان بول رہا تھا، میں نے اندازہ لگایا کہ اسے اس زبان پر اچھا خاصا عبور حاصل تھا۔ جب ہم اپنی اپنی پسند کی مشروب کا گلاس لے کر بیٹھے، تو میں نے پوچھا کہ اس نے روسی زبان کب اور کیسے سیکھی تھی؟

"یہ ایک لمبی کہانی ہے"۔ نوربرٹ نے کہا۔ شاید وہ ٹالنا چاہتا تھا۔

"میرے پاس یہ کہانی سننے کیلئے پوری رات پڑی ہے"۔ میں نے جواب دیا۔

"پاپا میں بھی تمہاری کہانی سننا چاہتی ہوں مجھے یقین ہے کہ اس دوران اس میں ضرور اضافہ ہو چکا ہوگا"۔ ہلڈے باپ کو شہ دے رہی تھی۔ اس نے ہنستے ہوئے میری طرف دیکھا اور بتایا کہ وہ بچپن سے اپنے باپ کی داستان سنتی آئی تھی، جس میں ہر بار اضافہ ہو جایا کرتا تھا۔

"ہلڈے اپنی ماں پر گئی ہے۔ دونوں کو سراغ رسانی کی کہانیاں پڑھنے کا شوق ہے۔ مگر میرے راز کو یہ کبھی نہ پاسکیں گی۔ وہ میرے سینے میں دفن ہے اور میں اس کو اپنے ساتھ قبر میں لے جاؤں گا"۔

نوربرٹ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران روس میں تھا۔ اس لئے میں نے گمان کیا کہ اس نے روسی زبان وہاں پر سیکھی ہوگی۔ میں نے کہا:

"جنگ میں تو صرف گولیوں کی زبان بولی جاتی ہے، جس کو انسان مترجم کے بغیر سمجھ سکتا ہے۔ جب کہ انسانوں کی بولی سیکھنے کے لئے مقامی لوگوں سے بات چیت کرنی ضروری ہے"۔ میں نوربرٹ کی زبان دانی کا راز جاننا چاہتا تھا۔

نوربرٹ نے میری بات کو ہاتھ کے اشارے سے ایک طرف دھکیل دیا۔ اس نے کہا: "زبان سیکھنے کے لئے اتنا کافی ہے کہ انسان ملک کی فضا میں سانس لے اور کھلی آنکھوں کے ساتھ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے"۔

میں نے کہا: "مجھے روسی فضا میں سانس لیتے ہوئے چوبیس گھنٹے ہو گئے ہیں بغیر اس کے کہ روسی زبان کا ایک لفظ بھی میرے پلے پڑا ہو۔ اگر ہلڈے نے کل شام ماسکو کی فضا سے دو چار لفظ چن کر اپنے حافظے میں محفوظ لے لئے ہوں، تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں بدستور کورے کا کورا ہوں"۔

ہلڈے کو روسی زبان کے کچھ الفاظ آتے تھے۔ اس نے ان کی گردان شروع کر دی۔ اس نے کہا کہ ان لفظوں کو سیکھنے کے لئے اسے روس کا سفر اختیار کرنے کی زحمت اٹھانے کی ضرورت نہ تھی۔ اتنے الفاظ یورپ کا ہر باشندہ جانتا ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ لفظوں کے اس ذخیرے سے انسان ریستوران میں کافی کی ایک پیالی کا آرڈر تک نہیں دے سکتا۔

میں نے کہا: "انسان ہاتھ پاؤں کو استعمال میں لا کر بہت کچھ کہہ سکتا ہے۔ جب میں جرمنی میں وارد ہوا، تو مجھے جرمن زبان کا ایک لفظ بھی نہیں آتا تھا۔ ابتدائی دنوں میں جب میں کسی اسٹور میں کچھ خریدنے کے لئے جاتا تھا، تو محض ہاتھ کے اشاروں سے کام چلاتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں گونگوں کا ایک خاندان پایا جاتا تھا، جن کو لوگ کلے کہتے تھے۔ وہ ہاتھ کے اشاروں اور منہ سے نکلنے والی عجیب و غریب آوازوں سے کام چلاتے تھے۔ جرمنی پہنچ کر مجھے یوں لگا، جیسے میں کلا بن گیا تھا۔ مگر اس خاندان کے برعکس میری شنوائی کام کرتی تھی اور ہر گذرنے والے روز کے ساتھ ساتھ میرے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہوتا جاتا تھا"۔

" یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ ملک کی فضا میں سانس لینے سے انسان زبان سیکھ جاتا ہے"۔ نوربرٹ کے چہرے پر فتح کی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

پھر بات جنگ کے بارے میں چل نکلی، جس کا بیشتر حصہ نوربرٹ نے روس کے فرنٹ پر گذارا تھا۔ اس نے کہا کہ اس نے ساری جنگ کے دوران کسی پر گولی نہیں چلائی تھی اور نہ ہی کسی کو مارا تھا۔ اسکے باوجود اسے پتہ تھا کہ اگر وہ روسیوں کے ہتھے چڑھ جاتا، تو اسے موت کی سزا ملتی، کیونکہ وہ اپنی بریگیڈ میں روسی زبان کا مترجم تھا، جسکے سبب دوست دشمن سب اسکے نام سے واقف تھے۔

" کسی انسان پر گولی نہ چلانے اور کسی کو نہ مارنے کی بات جنگ میں حصہ لینے والے سب لوگ کرتے ہیں۔ میری ملاقات کسی سابقہ جرمن فوجی سے نہیں ہوئی، جس نے یہ بات نہ کہی ہو۔ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کون لوگ تھے، جنہوں نے سارے یورپ میں تباہی مچادی تھی اور کروڑوں انسان کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ ہماری گائیڈ یلینا نے بتایا تھا کہ ہر دس روسی فوجیوں میں سے، جنہوں نے جنگ میں حصہ لیا تھا، صرف دو زندہ واپس لوٹے تھے"۔ میں نے کہا: "یہ روسیوں کا حوصلہ ہے کہ جرمن ٹورسٹوں کو اپنے ملک میں داخل ہونے دیتے ہیں"۔

اس پر نوربرٹ نے قہقہہ لگا کر کہا: "وہ ہمیں اس لئے ملک میں داخل ہونے دیتے ہیں، کیونکہ ہم جرمن مارک لے کر آتے ہیں۔ اگر ہم نہ آئیں، تو ان کی ٹورسٹ انڈسٹری کیسے چلے؟"

میں نے کہا:" انسان صرف روٹی کھا کر زندہ نہیں رہتا۔اس کیلئے دوسری چیزیں ویسی ہی ضروری ہوتی ہیں۔ہمیں سوچنا چاہیئے کہ دوسری عالمگیر جنگ میں بیس کروڑ ہم جیسے روسی مارے گئے تھے۔ان لوگوں کے رشتہ دار، دوست یار اور کولیگ ابھی زندہ ہیں۔انکو کیسا لگتا ہوگا، جب وہ جرمن ٹورسٹوں کو ،جنکی آنکھیں امارت کی چربی کے سبب نہیں کھلتیں ، اپنے ملک میں دندناتے پھرتے ہوئے دیکھتے ہونگے"۔

نوربرٹ نے جواب دیا:" روسیوں کی غربت کا باعث کمیونزم کا نظام ہے،جس نے انسانوں کی ساری آزادیاں اور حوصلے سلب کر لئے ہیں۔ جتنے انسان دوسری عالمگیر جنگ میں مارے گئے تھے، اس سے زیادہ لوگ اسٹالن کے حکم پر بیگار کیمپوں میں قید رکھے گئے تھے،جن میں سے بہت کم لوگ زندہ بچ کر لوٹے تھے"۔

ہلڈے نے یہ کہہ کر ہماری محفل کا خاتمہ کر دیا کہ وہ اس بارے میں مزید کچھ نہیں سننا چاہتی۔ وگرنہ ہم تو اس رات روس کے سارے مسائل حل کرنے کی ٹھانے ہوئے تھے۔

اگلے روز منہ اندھیرے تاشقند کیلئے روانہ ہوئے ، جو ماسکو سے تین ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔بیس لاکھ کی آبادی کے اس شہر کا ایک بڑا حصہ زلزلوں کی نذر ہو چکا ہے، جو وہاں پر تواتر سے آتے رہتے ہیں۔آخری تباہ کن زلزلہ ۱۹۶۶ء میں آیا تھا،جسکا مرکز شہر کے مضافات میں آٹھ کلومیٹر زیر زمین پایا جاتا تھا۔اس روز پورا شہر ڈھے گیا تھا،مگر جانی نقصان بہت کم ہوا تھا، کیونکہ لوگ بروقت گھروں سے باہر نکل گئے تھے۔قدیمی عمارتوں میں سے صرف ایک مدرسہ اور ایک مسجد باقی بچے تھے۔

پہلا پہر شہر کی سیاحت میں لگ گیا، جس کے دوران نوربرٹ ہمارے ساتھ تھا۔پچھلے پہر ایک ثقافتی پروگرام رکھا گیا تھا، جس میں شامل ہونے سے نوربرٹ نے معذوری کا اظہار کیا، کیونکہ وہ جرمن آبادکاروں کی تلاش میں جانا چاہتا تھا، جن کا پتہ اسے ماسکو میں کسی نے دیا تھا۔ میں نے بھی رخصت چاہی۔اس لئے نہیں کہ مجھے ثقافتی پروگراموں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دراصل مجھے منظر سلیم سے ملنا تھا، جو اس زمانے میں تاشقند میں مقیم تھے۔انہوں نے مجھے لکھا تھا کہ ان کے گھر پر فون نہیں ہے۔اس لئے بہتر ہوگا کہ میں خود ان کے گھر پر آ جاؤں۔

مقامی گائیڈ نے کہا کہ میں انڈر گراونڈ ریل گاڑی سے جاؤں، تو وہ مجھے سیدھی اس سڑک پر پہنچا دے گی، جس پر منظر سلیم کا مکان واقع ہے۔میں نے متعلقہ اسٹیشن سے باہر نکل کر بلاک کا نمبر تلاش کرنا شروع کیا، تو ایک عجیب وغریب صورت حال سے واسطہ پڑا۔ مجھے بلاک نمبر ۳۵ میں جانا تھا۔جبکہ

میرے سامنے بلاک نمبر ۶۰ تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں اس طرف چل دوں، جس طرف نمبر کم ہو رہے ہیں، تو پندرہ بیس منٹوں میں بلاک نمبر ۳۵ تک پہنچ جاؤں گا۔ مگر بلاک نمبر ۵۸ کے بعد ۵۷ نمبر کی جگہ پر بلاک نمبر ۶۵ آ گیا۔ میں تھوڑا آگے بڑھا، تو بلاک نمبر ۱۰۵ کے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے الٹے رخ پر چلنا شروع کیا، تو پھر ایک بار نمبر کم ہونے کی بجائے بڑھنے لگے۔ میں ایک راہی سے مدد کا خواستگار ہوا۔ اس نے دو تین آدمیوں کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد مجھے چوک کے دوسری طرف والی سڑک پر جا کر دیکھنے کی ہدایت کی۔ مگر وہاں کے نمبر بالکل مختلف نکلے۔ کسی نے کہا کہ ٹریم میں بیٹھ کر دو تین اسٹیشن پیچھے جا کر دیکھوں۔ میں نے اس پر بھی عمل کر کے دیکھا۔ راستے میں یونیورسٹی کے ایک طالب علم نے بتایا کہ دراصل جب پہلے پہل بلاک تعمیر کئے گئے، تو انکے درمیان بہت سا فاصلہ رکھا گیا تھا تا کہ وہاں پر باغیچے لگائے جا سکیں۔ آگے چل کر آبادی کے بڑھ جانے کے سبب مزید بلاک تعمیر کرنے کی ضرورت پڑی، تو بلاکوں کے درمیان خالی پڑے ہوئے رقبے میں نئے بلاک بنائے گئے۔ اب ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ سب بلاکوں کو سلسلہ وار نئے نمبر دیئے جاتے، مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ اس کی بجائے پرانے بلاکوں کے نمبر قائم رہے اور نئے بلاکوں کو نئے نمبر دیئے گئے۔ طالب علم بھی مجھے میری منزل مقصود تک نہ پہنچا سکا۔ جب مجھے وہاں پر گھومتے ہوئے دو تین گھنٹے ہو گئے اور شام پڑ جانے کے سبب اندھیرا ہونے لگا، تو میں نے ہوٹل واپس جانا مناسب سمجھا، جہاں پر ہلڈے میری راہ تک رہی تھی۔

نوربرٹ رات پڑنے کے بعد بہت دیر سے لوٹا۔ اس کا مہمان نواز منفریڈ اس کو ہوٹل میں پہنچانے کے لئے خود ساتھ آیا تھا۔ وہ اچھی خاصی جرمن بول لیتا تھا۔ پتہ چلا کہ اس کی پیدائش کریمیا کی تھی، جہاں پر ایک زمانے میں خالص جرمن گاؤں پائے جاتے تھے۔ چونکہ ان لوگوں کی ہمدردیاں جنگ کے دنوں میں جرمن فوج کے ساتھ تھیں، اسلئے اسٹالن کے حکم پر ان کو کریمیا کے علاقے سے نکال کر دوسری سوویٹ ری پبلکوں میں بکھیر دیا گیا تھا۔ مقصد جرمن قومیت کو سزا دینا تھا۔ تاتاروں نے بھی نازی فوجوں کا ساتھ دیا تھا، اسلئے ان کو سائبیریا کے علاقے میں جلاوطن کر دیا گیا تھا، جہاں پر وہ آج تک آباد ہیں۔ ان کو اپنے آباء واجداد کی سرزمین کی طرف لوٹنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ نوربرٹ وہاں پر جا چکا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہاں پر بھی اکا دکا جرمن آباد ہیں۔ مگر وہ لوگ اپنی مادری زبان بھولتے جا رہے ہیں، کیونکہ وہاں پر جرمن پڑھانے کا کوئی انتظام نہیں ہے اور جرمن اسکول اور چرچ سرے سے پائے ہی نہیں جاتے، جن کے ذریعے دوسرے علاقوں میں جرمن زبان زندہ رہ سکی تھی۔ ہمارا گروپ اگلی صبح سمرقند جا رہا تھا، جہاں پر منفریڈ کا دوست ہائینز رہتا تھا۔ اسکے نام اس نے ایک رقعہ لکھ دیا، جس میں تاکید کی گئی تھی

کہ نوربرٹ کی ملاقات جرمن آبادکاروں سے کرائی جائے۔ ہم نے چونکہ پانچ روز کے بعد تاشقند لوٹ کر آنا تھا، جہاں سے ہمیں اپنے باقی ماندہ سفر کے لئے فلائیٹ لینی تھی۔ اسلئے منفریڈ نے وعدہ کیا کہ وہ ہماری واپسی تک یوکرین سے آنے والی جرمن فیملیوں کا سراغ لگائے گا، جنکے بارے میں اس نے سن رکھا تھا کہ کچھ لوگ تاشقند کے قرب وجوار میں رہتے ہیں۔

سمرقند کے سفر کے لئے ہمیں پروپیلر جہاز ملا۔ نوربرٹ ہلڈے کی زبانی میری ناکامی کا ذکر سن چکا تھا۔ خود اس کی اپنی مہم بھی کچھ ایسی کامیاب نہ رہی تھی۔ اس کی ملاقات تین جرمن خاندانوں کے ساتھ ہوئی تھی، مگر وہ لوگ اسے یوکرین سے آنے والی کسی فیملی کا اتا پتا نہ دے سکے تھے۔ اس کو اس بات کا بے حد افسوس تھا کہ لوگ ایک دوسرے کی خبر نہیں رکھتے۔ کسی کو پتہ نہیں تھا کہ اس شہر میں اور اس کے گردونواح میں کتنی جرمن فیملیاں رہتی ہیں اور وہ کن علاقوں سے ہجرت کر کے آئی ہیں۔

"تم خاص طور پر یوکرین سے آنے والی فیملیوں کو کیوں ڈھونڈ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اس لئے کہ میں اس علاقے سے خوب واقف ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ مجھے کوئی جان پہچان والا مل جائے، جس سے میں اپنے واقف کاروں کے بارے میں معلومات حاصل کرسکوں"۔

ہلڈے نے بتایا کہ اس کا باپ یوکرین میں خاص دلچسپی رکھتا ہے۔ اس کے پاس تھرڈ رائش کے زمانے کے نقشے پڑے ہیں، جن کا مطالعہ وہ ہر اتوار کو بے حد انہماک کے ساتھ کرتا ہے۔

میرا خیال تھا کہ وہاں پر اس قدر تبدیلیاں آچکی ہیں کہ پرانے نقشے کسی کام کے نہیں رہے۔ یوں بھی سویٹ یونین میں بیشتر ناموں کو بدل دیا گیا تھا اور نئے شہر اور دیہات پیدا ہو گئے تھے، جن کو آئرن کرٹن سے باہر کی دنیا بالکل نہیں جانتی۔

نوربرٹ نے میری بات کو ہاتھ کے اشارے سے رد کر دیا۔ اس نے کہا کہ وہ ایک ایک گاؤں اور ہر ہر شہر سے بخوبی واقف ہے۔ وہ وہاں پر آنے والی تبدیلیوں کے بارے میں سارا سال مختلف ذرائع سے معلومات حاصل کرتا اور ان کا اندراج اپنے نقشے میں کرتا رہتا ہے۔

"کیا تم یہی معلومات حاصل کرنے کے لئے ہر سال سویٹ یونین کا سفر کرتے ہو؟" مجھے یقین ہو چلا تھا کہ نوربرٹ خفیہ ایجنٹ تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے سپرد جرمن آبادکاروں سے رابطہ رکھنا لگایا گیا ہو۔ مگر یہ بات روس کی خفیہ ایجنسی KGB سے بھلا کیسے پوشیدہ رہ سکتی تھی؟

نوربرٹ نے بتایا کہ دوسری عالمگیر جنگ کے ابتدائی دنوں میں وہ یوکرین کے علاقے میں تھا، جہاں پر اس کے سپرد جرمن آبادکاروں کے اندر نازی پارٹی کا پروپیگنڈا کرنا تھا۔ اس نے رضاکاروں

کی ایک خفیہ پلٹن بنائی تھی ، جس کا کام روسی فوج کی نقل وحرکت میں خلل ڈالنا تھا۔ کچھ عرصہ تک یہ کاروائی خفیہ طور پر جاری رہی ، مگر کسی طریق سے KGB کو خبر ہوگئی اور اس نے جرمن آبادکاروں کے گھروں پر چھاپے ڈالنے شروع کئے ۔ چنانچہ اس فارم کی بھی تلاشی لی گئی ۔ جس میں نوربرٹ چھپ کر رہتا تھا۔ اس کی جان صرف اس وجہ سے بچ سکی کہ چھاپہ پڑنے کے وقت وہ مویشی خانے میں گھاس کے بنڈلوں کے اندر چھپا ہوا بیٹھا تھا ، جس کی طرف سے ان خاندان کی نوجوان لڑکی برونہلڈ نے بڑی ہوشیاری سے روسی فوجوں کی توجہ کو ہٹالیا۔ اس کی ننگی پنڈلیوں نے ان پر ایسا سحر کیا کہ وہ مویشی خانے کی تلاشی لینے کا خیال بھول کر لڑکی کے پیچھے ہولئے ، جو کسی چھلاوے کی طرح ان کو ایک جھلک دکھا کر غائب ہوگئی تھی ۔ فوجی مویشی خانے کو پشت پر چھوڑتے ہوئے لڑکی کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے ۔ جو خوش قسمتی سے ان کے ہاتھ نہ لگی ۔

سمرقند وسطی ایشیا میں بہت اہمیت کا حامل ہے ۔ وہاں پر دوسرے شہروں سے زیادہ قدیمی آثار پائے جاتے ہیں ۔ ریگستان نامی میدان میں تین مدارس آمنے سامنے کھڑے ہیں ، جیسے وہ ایک دوسرے سے مقابلے کے لئے بنائے گئے ہوں ۔ بالخصوص تیمور کے پوتے الغ بیگ کا تعمیر کردہ مدرسہ خوبصورتی میں بے مثل ہے ۔ وہ یوں بھی اپنی علم پسندی کے سبب اپنے خاندان میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ اس کی بنائی ہوئی رصدگاہ کے ۴۲ گز لمبے آلہ سدس میں سے ، جس کے ذریعے زاویاتی فاصلے ماپے جاتے اور سماوی اجرام کا ارتفاع معلوم کیا جاتا تھا اور جو ایک تین منزلہ عمارت میں بنایا گیا تھا ، وہ حصہ دیکھا جاسکتا ہے ، جو زیرزمین ہوا کرتا تھا۔ الغ بیگ کا مقولہ تھا کہ راجدھانیاں آتی جاتی چیز ہیں ، مگر علم کی دنیا میں سرانجام دیئے گئے کارنامے رہتی دنیا تک قائم رہیں گے ۔ اس کے وقت میں سال کی لمبائی کا جو حساب لگایا گیا تھا ، اس میں اور ہمارے وقتوں کی پیمائش میں صرف دوسیکنڈ کا فرق پایا جاتا ہے ۔

ہمارا گروپ ایک روز کیلئے تیمور کے وطن شہرسبز بھی گیا ، جہاں پر اس کے باپ کا مرقد پایا جاتا ہے ۔ جب اس کا بڑا بیٹا جہانگیر عین جوانی کے عالم میں ایک لڑائی میں مارا گیا ، تو تیمور نے اس کو ایک مسجد کے پہلو میں دفن کیا ۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے خاندان کے سب لوگ وہاں پر دفنائے جائیں ، مگر اس پر عمل نہ ہوسکا ، تیمور کی موت چین پر ایک مہم کے دوران ہوئی ۔ جانشینی کی خانہ جنگی کے سبب ابتداء میں اس کو پوشیدہ رکھا گیا ۔ اس کے بیٹے شاہ رخ کو جب اپنے بھائیوں سے لڑنے بھڑنے اور ان کو موت کے گھاٹ اتارنے سے فراغت ہوئی ، تو تیمور کو سمرقند میں دفن ہوئے بہت دن ہو چکے تھے ۔ اس لئے وہی اس کا مرقد ٹھہرا۔ آگے چل کر الغ بیگ کو اپنے دادا کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ چند برس ادھر سویٹ ماہرین

آثار قدیمہ نے دونوں قبروں کو کھول کر نعشوں کا معائنہ کیا، تو پتہ چلا کہ تیمور کی ایک ٹانگ فی الواقعہ تین سینٹی میٹر چھوٹی تھی اور الغ بیگ کا سر اس کے دھڑ سے جدا تھا۔ اس کو حج سے واپسی پر اس کے بیٹے کی سازش پر راستے میں ہی مار ڈالا گیا تھا۔ اس کے بارے میں یہ مشہور کیا گیا تھا کہ اس نے ساتویں آسمان سے انکار کیا تھا، اسلئے گردن زنی ٹھہرا تھا۔

ہم تیمور کے خاندانی محل کے کھنڈرات کو دیکھنے کے بعد بس کی طرف لوٹ رہے تھے کہ ایک کوچے میں ہمیں ایک چھوکرے نے اپنی حویلی میں آنے کی دعوت دی۔ حویلی کے بڑے پھاٹک کے پیچھے گھر کی خواتین بڑے بڑے پلنگ بچھا کر سہ پہر کی چائے پی رہی تھیں۔ انہوں نے خندہ پیشانی کے ساتھ ہمارا استقبال کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سب کے لئے کرسیاں، موڑھے اور چوکیاں جمع کر لی گئیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ لوگ آئے دن اتنی بڑی تعداد میں آنے والے مہمانوں کے لئے ساز و سامان سے پوری طرح لیس تھے۔ نور برٹ کی زبان دانی اس موقع پر خوب کام آئی۔ پتہ چلا کہ اس حویلی میں تیمور کی نسل کے ایک خاندان کے کئی گھر آباد تھے۔ ان کے درمیان مثالی اتفاق پایا جاتا تھا۔ خاندان کا سربراہ ایک بوڑھا مرد تھا، مگر حکم وہاں پر عام طور سے عورتوں کا چلتا تھا، جن کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ ہوسکتا تھا۔ ان کے رشتے خاندان کے اندر ہوتے تھے، جس کے سبب فیملیوں میں پیدا ہونے والے مسائل باہمی صلاح و مشورے سے طے پاتے تھے۔ گذشتہ کئی نسلوں سے ایک رشتہ میں بھی نوبت طلاق تک نہ آئی تھی۔

شہر سبز سے سمرقند واپسی کے راستے میں نور برٹ اپنے خاندان کے مختصر پن کا رونا روتا رہا۔ اس کی فیملی میں تین نسلوں سے صرف ایک بیٹا ہوتا آیا تھا اور اب یہ سلسلہ بھی رک گیا تھا۔ میں نے کہا کہ کیا ضروری ہے کہ ہر خاندان کی نسل رہتی دنیا تک چلتی رہے۔ نور برٹ نے یہ بات سن کر میری طرف اس طرح گھور کر دیکھا، جیسے میرا دماغ چل گیا ہو۔

ہم کہیں آدھی رات کے بعد سمرقند واپس پہنچے۔ دوسرے روز نور برٹ پھر جرمن فیملیوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ میں ہلڈے کی معیت میں سیر کرتا پھرا۔ تیمور کی چہیتی بی بی خانم کی مسجد خوبصورتی میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ اس زمانے میں اس کے گنبد کی مرمت ہو رہی تھی، جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کے معمار نے بی بی خانم سے، جس کے حسن کا آج تک چرچا ہے، تیمور کی غیر موجودگی، جب وہ ہندوستان کی مہم پر نکلا ہوا تھا، ایک بوسہ مانگا تھا۔ بی بی خانم نے بارہ انڈے منگوائے، جن پر مختلف رنگوں سے روغن کیا گیا تھا۔ اس نے کہا کہ سب انڈے باہر سے مختلف نظر آتے ہیں، مگر اندر سے ایک جیسے ہیں

۔یہی حال عورتوں کا ہے۔اس پر معمار نے بارہ گلاس منگوائے ،جن میں سے گیارہ میں پانی اور بارہویں میں شراب ڈالی گئی تھی ۔اس نے کہا کہ باہر سے سارے گلاس ایک جیسے لگتے ہیں،مگر گیارہ میں پانی ہے اور ایک میں شراب ہے۔بی بی خانم نے لاجواب ہوکر اسے بوسہ دینے دیا۔جس جگہ پر معمار نے بوسہ دیا تھا، وہاں پر ایک مسہ نکل آیا۔جب تیمور ہندوستان کی مہم سے لوٹا،تو وہ اس مسے کو دیکھ کر جان گیا کہ اس کی غیر موجودگی میں کسی نے اس کی چہیتی کو بوسہ دیا تھا۔کہتے ہیں کہ اس نے بی بی خانم کو بے وفائی کے سبب مروادیا تھا۔پھر وہ معمار کو مارنے کے لئے مسجد میں پہنچا،تو معمار گنبد پر کام کر رہا تھا۔جب اس کو للکار کر نیچے اترنے کو کہا گیا،تو وہ اوپر کی طرف پرواز کر گیا۔

ہلڈے نے کہا کہ اگر بوسہ دینے سے مسے نکل آتے ہیں،تو پھر اس کا سارا جسم میرے بوسوں سے بھر جانا چاہیئے تھا۔میں نے کہا کہ شاید میرے بوسے ویسی تاثیر نہیں رکھتے۔البتہ اگر حمل ٹھہر گیا،تو پھر مشکل پڑ جائے گی ۔ ہلڈے نے جواب دیا کہ اس بات کا امکان نہیں پایا جاتا ، کیونکہ اس کی بچہ دانی آپریشن کے ذریعہ نکالی جا چکی ہے۔ پتہ چلا کہ اینٹی بے بی گولیوں کے لمبے استعمال کے نتیجے میں اس کے رحم میں کینسر ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا،جس سے بچنے کے لئے رحم کو ہی کھرچ کر صاف کر دیا گیا تھا۔

نوربرٹ شام کو اپنی مہم سے واپس لوٹا،تو اس نے کہا پتہ نہیں چلتا کہ یوکرین کے آبادکار کہاں پر غائب ہو گئے ہیں۔وہ سارے کے سارے کہیں مرکھپ تو نہیں گئے؟ البتہ سمرقند میں اسے بتایا گیا تھا کہ تاشقند میں کچھ خاندان اس علاقے کے رہنے والے موجود ہیں، جہاں کے ایک گاؤں کے باسیوں کو نوربرٹ تلاش کر رہا تھا۔ وہ فوراً تاشقند واپس لوٹ جانا چاہتا تھا،مگر مشکل یہ تھی کہ ٹورسٹوں کو اپنے گروپ کے ساتھ رہنا پڑتا تھا، کیونکہ ان کو اجتماعی ویزا جاری ہوتا تھا۔گویا نوربرٹ کو مزید دو روز تک ہمارے ساتھ سفر کرنا تھا۔

اس سے اگلے روز ہم بخارا میں وارد ہوئے ، جہاں پر آدھی آبادی کا تعلق تاجک قوم سے ہے اور وہ فارسی بولتی ہے۔ہماری مقامی گائیڈ ساجدہ بھی فارسی دان تھی۔اس نے بتایا کہ اسکے ماں باپ کے گھر میں نماز و روزہ کی پابندی ہوتی ہے اور گھر کے افراد قرآن خوانی بھی کرتے ہیں۔البتہ گھر سے باہر انکو روسی بولنی پڑتی ہے۔اس نے کہا کہ گھر میں داخل ہونے سے پہلے وہ روسی زبان اور تہذیب کو جوتیوں کی طرح دروازے پر چھوڑتی ہے اور اندر جا کر اپنا روایتی تاجک لباس پہن لیتی ہے۔

ہمارا ہوٹل شہر کے ماڈرن حصے میں تھا، جہاں پر ساری عمارتیں سیمنٹ اور کنکریٹ کی تھیں اور

نہایت بے جان لگتی تھیں۔اس کے مقابلے میں قدیمی شہر کے اکثر مکانات کچے تھے،جن کے لئے کسی قسم کی ایرکنڈیشنگ کی ضرورت نہ تھی۔لوگوں کے گھروں میں اس زمانے میں کسی کے ہاں کولر نہیں ہوتا تھا۔ پینے کے پانی کو صراحیوں میں رکھا جاتا تھا۔ ماڈرن فرنیچر کی بجائے لوگ قالینوں پر بیٹھتے تھے۔اس علاقے کے قالین بہت خوبصورت اور پائیدار ہوتے ہیں۔

نوربرٹ نے کہا کہ یوکرین میں بھی آرام وآسائش کی ماڈرن چیزیں نہیں ہوتی تھیں۔لوگ یوں بھی اتنے غریب تھے کہ کوئی چیز خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔زمینداروں کو ملکیت زمین سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔ان کو مشترکہ فارموں میں کام کرنا پڑتا تھا،جن کے کرتا دھرتا پارٹی کے کارندے ہوتے تھے۔کسانوں کی حیثیت مزدوروں کی بن گئی تھی،جن کے حقوق کاغذ پر تو بہت سے لکھے ہوئے تھے،مگران کی ذمہ داریاں اس سے بڑھ کر تھیں۔اس لئے کسان ویسی جان ماری نہیں کرتے تھے ،جیسی وہ اس زمانے میں کیا کرتے تھے،جب زمین خود ان کی اپنی ملکیت ہوتی تھی۔بالخصوص جرمن آباد کاروں میں اشتراکی نظام کے خلاف بہت غصہ پایا جاتا تھا،جس کے سبب نوربرٹ کو نوجوانوں کی خفیہ پارٹی بنانے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی تھی۔

ہم بخارا کی سیر کو نکلے،تو نوربرٹ بھی خلاف معمول ہمارے ساتھ تھا۔اسے بخارا میں رہنے والے کسی جرمن کا پتہ نہیں مل سکا تھا۔ساجدہ ہمیں قدیمی شہر کے مرکز میں لے گئی، جہاں پر مینار پائے کلاں اوراس کے پہلو میں ایک طرف بڑی مسجد اور دوسری طرف مدرسہ میر عرب پائے جاتے ہیں۔ پائے کلاں کے بنائے جانے کی وجہ تو شاید یہ تھی کہ شہر پر حملہ آور فوجوں کی نقل وحرکت پر نظر رکھی جا سکے۔ مگراس کے بارے میں مشہور ہے کہ سزائے موت پانے والے بغاوت کے مجرموں کو بورے میں ڈال کر مینار کی بلندی سے نیچے پھینک دیا جاتا تھا، جہاں پر عوام کو عبرت حاصل کرنے کے لئے جمع ہونے کا حکم ہوتا تھا۔نوربرٹ نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ہم خانان بخارا کے وقتوں میں نہیں جی رہے، وگرنہ اس کا بھی یہی حشر ہوتا، کیونکہ جو کچھ اس سے سرزد ہوا تھا، وہ بغاوت سے کم نہ تھا۔

میں نے پوچھا:"اگر تم پر بغاوت کا الزام لگ سکتا ہے،تو پھر تم کیسے سویٹ یونین میں آزادی سے گھوم پھر رہے ہو؟"

اس نے جواب دیا:"میں اپنا راز بتا کر خود اپنے گلے میں پھانسی کا پھندا نہیں ڈلوانا چاہتا"۔

مدرسہ میر عرب شاید اس ملک کا واحد مدرسہ تھا،جس میں اس زمانے میں دینی تعلیم کا سلسلہ جاری تھا۔گیٹ پر ہماری ملاقات دو نوجوان طالب علموں سے ہوئی۔جن کو فارسی بس واجبی سی آتی تھی۔

البتہ وہ عربی سے خوب واقف تھے۔ پتہ چلا کہ سارے روسی ترکستان کی ریاستوں سے نوجوان طالب علم دینی تعلیم کی خاطر وہاں پر آتے تھے۔ ان کو بھیجنے والے شہروں کو نہ صرف ان کے اخراجات برداشت کرنے پڑتے تھے، بلکہ سرکار کو ماہوار فی کس ایک سو پچاس روبل حرجانہ ادا کرنا پڑتا تھا، کیونکہ حکومت ان کی خدمات سے محروم ہو جاتی تھی۔

نوربرٹ نے کہا کہ اس کی بنائی ہوئی خفیہ تنظیم کے لوگوں نے حکومت کے کاموں میں بہت رخنہ ڈالا تھا، مگر وہ اتنی ہوشیار مندی کے ساتھ کام کرتے تھے کہ ان کو پکڑا نہ جا سکا تھا۔ جہاں تک اسکے وجود کا تعلق تھا، اسکے بارے میں کسی کو پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں سے آیا تھا، کہاں پر رہتا تھا اور آخر میں کہاں غائب ہو گیا تھا۔

ساجدہ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد ہمیں ایک چائے خانے میں لے گئی، جو ایک تالاب کے کنارے پر بنا ہوا تھا۔ وہاں پر گھنے درختوں کے سائے میں پلنگ نما چوکیاں رکھی ہوئی تھیں، جن میں سے ہر ایک پر چار آدمیوں کے بیٹھنے کے لئے جگہ تھی۔ ہم تینوں نے اپنی چوکی دوسروں سے الگ تھلگ جمائی، کیونکہ ہماری گفتگو ایک ایسے نازک مرحلے پر پہنچ گئی تھی کہ اس کی بھنک بھی دوسروں کے کانوں میں نہیں پڑنی چاہیئے تھی۔

ہلڈے نے کہا: "اس سفر کے دوران مجھے پاپا کے بارے میں بعض نئی باتوں کا پتہ چلا ہے، جن کو اس نے اب تک اپنے خاندان سے چھپا رکھا تھا"۔

نوربرٹ نے جواب دیا: "یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میرے سینے میں اس سے بڑے راز پوشیدہ ہیں"۔

شام پڑنے تک ہم نے بخارا کی تمام اہم تاریخی عمارتیں دیکھ لی تھیں اور سارا دن پیدل چلنے کے سبب اسقدر تھکے ہوئے تھے کہ ہوٹل میں پہنچ کر ہر کوئی اپنے اپنے بستر میں جا دبکا۔ ہمیں اس سے اگلے دن تاشقند واپس لوٹنا تھا، جہاں پر ایک روز آرام کرنیکے بعد ہمیں جورجیا، آرمینیا اور آذربائیجان کی سیاحت کیلئے روانہ ہونا تھا۔

ہمارا طیارہ دوپہر کے قریب تاشقند کے ہوائی اڈے پر اترا۔ مقامی گائیڈ ہمیں لینے کے لئے آیا ہوا تھا۔ اس کو بلاک نمبر ۳۵ کا سراغ لگانے میں کامیابی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے شہر کا نقشہ دیا، جس پر اس نے اس بلاک کو نشان زد کر رکھا تھا۔ میں خوش ہوا کہ بالآخر میری ملاقات منظر سلیم کے ساتھ ہو سکے گی۔ میں نے شام کو ان کی طرف جانے کا ارادہ کر لیا۔ اس روز سیاحت کا کوئی پروگرام نہیں رکھا گیا تھا۔

ہر کوئی اپنی مرضی کے مطابق شام گذار سکتا تھا۔ گروپ کے کچھ لوگ سرکس دیکھنے کے لئے جا رہے تھے۔ نوربرٹ نے اپنے واقف کار جرمن کے ساتھ ملنے کا وقت مقرر کر رکھا تھا۔ ہلڈے اس کے ساتھ جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔

اب کے مجھے بلاک نمبر ۳۵ کو تلاش کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ دوسری منزل پر دو فلیٹ تھے، جن میں سے میرے اندازے کے مطابق دائیں ہاتھ کا فلیٹ منظر سلیم کا ہونا چاہیئے تھا۔ دروازے پر لگی ہوئی نام کی تختی کا کیریلی رسم الخط میرے لئے ناقابل فہم تھا۔ میں نے دروازے کی گھنٹی بجائی، تو کافی دیر تک اندر کوئی ہلچل نہ ہوئی، جس کے سبب مجھے خیال گذرا کہ گھر پر کوئی نہ تھا۔ مگر پھر ایک عورت کی آواز سنائی دی، جو روسی میں شاید مجھے انتظار کرنے کو کہہ رہی تھی۔

چند لمحوں کے بعد ایک بھاری بھرکم محترمہ میرے سامنے کھڑی تھی، جو شاید سیدھی باتھ روم سے نکل کر آئی تھی، کیونکہ اس کے جسم سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ اس نے بالوں کو تولیئے میں لپیٹ رکھا تھا اور ایک ٹخنوں تک جانے والے ڈھیلے ڈھالے لباس میں ملبوس تھی۔ اس نے روسی میں کچھ کہا، جو میرے پلے نہ پڑا۔ میں نے انگریزی میں منظر سلیم کے بارے میں پوچھا۔ اس نے لمحہ بھر غور کیا۔ پھر جرمن میں کہا کہ اگر مجھے جرمن آتی ہے، تو میں اس سے اس زبان میں بات کر سکتا ہوں۔ یہ سن کر میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ میں نے جرمن میں منظر سلیم کے بارے میں استفسار کیا اور کہا کہ وہ ہندوستان کے رہنے والے ہیں اور کئی برسوں سے تاشقند میں رہائش پذیر ہیں۔

اس نے جواب دیا کہ اس نام کا کوئی آدمی اس بلڈنگ میں نہیں رہتا۔ البتہ اس نے ایک ہندوستانی کو اس علاقے میں ایک دو بار دیکھا ہے۔ مگر اسے پتہ نہیں ہے کہ اس کی رہائش کس بلاک میں ہے۔

اب قاعدے کے مطابق مجھے معذرت کرتے ہوئے واپسی کا راستہ لینا چاہیئے تھا، مگر میں نے ہمت کر کے پوچھ لیا کہ اسے جرمن کیوں کر آتی ہے اور کہیں وہ جرمن الاصل تو نہیں؟

اس نے جواب دیا کہ ایسی باتیں دروازے پر کھڑے ہو کر نہیں کی جا سکتیں۔ اس نے مجھے اپنے فلیٹ میں آنے کی دعوت دی اور ایک کمرے میں بیٹھنے کو کہا، جبکہ وہ خود حمام میں کپڑے بدلنے کے لئے چلی گئی۔

کمرے کا فرنیچر خاصا بوسیدہ تھا۔ فرش پر ایک گدلا سا قالین بچھا ہوا تھا۔ میز پر دو چار تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ایک نوجوان کی تصویر کے ایک کونے پر کالی پٹی بندھی ہوئی تھی، جیسی سوگواری کی

علامت کے طور پر لگائی جاتی ہے۔ میں اپنی کرسی پر سے تصویروں کو ٹھیک سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے قیاس کیا کہ وہ عورت کے عزیزوں کی تصویریں ہوں گی۔

میری نگاہیں ابھی گرد و پیش کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں کہ محترمہ کپڑے بدل کر کسی اجنبی عطر کی مہک کو پھیلاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی اور پوچھا کہ کیا میں چائے پینا پسند کروں گا یا ووڈکا۔ میں نے چائے کی خواہش کی۔ یوں بھی چائے کا وقت تھا اور میں باورچی خانے کے سامنے سے گذرتے ہوئے دیکھ چکا تھا کہ سماوار میں پانی ابل رہا تھا۔

وہ چائے لے کر لوٹی، تو میں نے پوچھا کہ کیا اس نے جرمن اپنے ماں باپ سے سیکھی تھی؟

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا: "اپنی ماں سے۔ باپ کو میں نے دیکھا ہی نہیں۔ اسے تو شاید پتہ ہی نہیں چلا ہوگا کہ وہ اپنے پیچھے ایک بچی کو چھوڑ گیا تھا۔ جب وہ میری ماں سے جدا ہوا، تو دونوں کو علم نہ تھا کہ ماں حمل سے تھی۔ وہ شاید جنگ میں مارا گیا ہوگا، کیونکہ وہ لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ اس نے میری ماں سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ اس سے شادی کرے گا۔ مگر اس کی نوبت نہ آسکی۔ ماں بہت دنوں تک اس کا انتظار کرتی رہی، کیونکہ اسے یقین تھا کہ میشا گلوگووسکی لوٹ کر آئے گا۔ اسکا خیال تھا کہ وہ جنگ کے بعد جرمنی چلا گیا ہوگا، جہاں کا وہ رہنے والا تھا۔ ماں کے پاس ایسے وسائل موجود نہ تھے کہ وہ اسکو اس ملک میں تلاش کرواسکتی"۔

میں نے کہا کہ جرمنی میں ملک بھر کی آبادی کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے اور انسان آسانی کے ساتھ قریب قریب ہر شخص کو تلاش کر سکتا ہے۔

اس نے کہا: "اس کام کے لئے روسی حکومت کا تعاون درکار ہوتا، جس کے ملنے کی امید نہیں تھی۔ ماں نے مجھے بتایا تھا کہ میرے باپ کے پیچھے خفیہ پولیس لگی ہوئی تھی۔ اس لئے اس کو یوکرین سے بھاگنا پڑا تھا"۔

میں نے کہا کہ جنگ نے بے شمار انسانوں کی زندگیوں کو تباہ کر دیا تھا۔ اس زمانے میں روسی فوج افغانستان میں لڑ رہی تھی اور مجھے شبہ تھا کہ وہ نوجوان، جس کی تصویر پر کالی پٹی لگی ہوئی تھی، وہیں کہیں مارا گیا ہوگا۔ مگر میں اس بارے میں براہ راست پوچھنا نہیں چاہتا تھا، کیونکہ وہ اس کا بیٹا ہوسکتا تھا۔ البتہ مجھے امید تھی کہ بات جنگ پر چل نکلی، تو وہ شاید خود ہی اس بارے میں کچھ بتائے گی۔ چنانچہ وہی ہوا۔

اس نے کہا: "ہاں جنگ نے میرے خاندان کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ میرا باپ اور ماموں

دوسری جنگ عظیم سے واپس نہیں لوٹے تھے اور اب میرا بیٹا میشا جلال آباد کے علاقے میں مارا گیا ہے۔ وہ روسی فوج میں پائیلٹ تھا۔ اس کی تو لاش بھی نہیں مل سکی"۔

مجھے احساس تھا کہ میں نے اس نازک موضوع کو چھیڑ کر اپنی مہمان نواز کو غمگین کر دیا تھا۔ اس لئے میں نے اس کے بیٹے کی موت پر تعزیت کرتے ہوئے رخصت چاہی۔

چلتے وقت میں نے اس کا نام جاننا چاہا، تو اس نے متھلڈے بتایا۔ بعد میں مجھے خیال آیا کہ یوکرین میں اس کے گاؤں کا نام بھی پوچھنا چاہیئے تھا۔ تاہم مجھے امید تھی کہ نوربرٹ اس ملاقات کے بارے میں سن کر خوش ہوگا۔ مگر وہ اس وقت تک واپس نہیں لوٹا تھا۔ میں آدھی رات تک اسکی راہ تکتا رہا۔ پھر سو گیا، کیونکہ ہمیں اگلے روز بہت سویرے ہوائی اڈے کیلئے روانہ ہونا تھا۔ ناشتہ ہمیں جہاز میں ملنا تھا۔

اگلی صبح ہماری مٹھ بھیڑ ہوائی اڈے پر جانے والی بس میں ہوئی۔ ہلڈے نے پوچھا کہ کیا میری ملاقات منظر سلیم سے ہوئی تھی۔ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس نے کہا کہ وہ بھی ناکام لوٹے تھے۔ نوربرٹ نے آنکھ کے اشارے سے ہمیں اس بارے میں مزید بات کرنے سے روک دیا۔ اس نے کہا کہ ہوائی جہاز میں ہمارے پاس تفصیلات سننے اور سنانے کے لئے بہت وقت ہوگا۔

طفلس کی پرواز تین گھنٹوں کی تھی، جس کے دوران نوربرٹ نے اپنے مشن کی ناکامی کا حال سنایا۔ اس کا واقف کار انہیں ایک فیملی کے ہاں لے گیا تھا، جسے علم تھا کہ برونہلد اپنی وفات تک تاشقند میں مقیم رہی تھی۔ اس کی لڑکی متھلڈے کی شادی ایک روسی کے ساتھ ہوئی تھی، مگر آپس کی ناچاقی کے سبب علیحدگی ہوگئی تھی۔ ان لوگوں کو پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں پر رہتی ہے۔ البتہ وہ یہ جانتے تھے کہ اس کا ایک بیٹا میشا نامی تھا۔

میں نے کہا: " تمہیں یقین تو نہیں آئے گا، مگر میں متھلڈے کے ہاں سے چائے پی کر آیا ہوں۔ اور اگر تم جنگ کے زمانے میں میشا گلوگووسکی کے نام سے جانے جاتے تھے، تو پھر وہ تمہاری بیٹی ہے، جو اپنی ماں کی طرح تمہارا انتظار کر رہی ہے"۔

میں نے اسے متھلڈے کے بیٹے کی موت کے بارے میں کچھ نہ بتایا، کیونکہ مجھے خطرہ تھا کہ وہ اپنی نسل کے خاتمے کی خبر کو برداشت نہ کر سکے گا۔ جرمنی واپس پہنچ کر میں نے منظر سلیم کا خط نکال کر ایڈریس کو چیک کیا، تو پتہ چلا کہ مجھ سے اسے ایڈریس بک میں درج کرتے ہوئے غلطی ہوگئی تھی۔ میں نے بلاک نمبر ۵۳ کی جگہ پر بلاک نمبر ۳۵ لکھا تھا۔

(کمر فیلڈ۔ مئی ۱۹۹۹ء)

آنے والا ماضی

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے بیگ کو اپنے قدموں میں دھرا تھا۔ مگر جب رخصت ہونے کے وقت میں اسے اٹھانے کیلئے جھکا، تو وہ غائب تھا۔ یہ ماجرا میرے ساتھ ایتھنز کے ایک میوزیم میں پیش آیا، جہاں پر میں خاص طور سے اسلامی آرٹ کے نمونوں کو دیکھنے کیلئے گیا تھا۔ ایک عربی مخطوطہ کا پہلا ورق شوکیس میں رکھا تھا، جسکا خط اسقدر عمدہ اور مصفّٰی تھا کہ انسان کاتب کی فنکاری کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے عبارت کو پڑھنا شروع کیا، تو میری دلچسپی اسمیں بڑھتی چلی گئی اور میں اس کام میں ایسا منہمک ہوا کہ اپنے قدموں میں دھرے ہوئے بیگ کو بھول گیا۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ کب کوئی اچکا اسے لے اڑا۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور شتابی سے ساتھ کے دو تین کمروں کا چکر لگایا، مگر سب بے سود۔ مجھے کہیں پر اپنا بیگ یا چور نظر نہ آیا۔ میں نے ایک محافظ کے پاس رپورٹ کی، جس نے میوزیم کے افسران بالا کو اطلاع کر دی۔ چور اس عرصہ میں یقیناً میوزیم سے باہر جا چکا تھا۔ رپورٹ کو تحریر میں لانے پر بہت سا وقت لگ گیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس معاملہ کو پولیس کے پاس بھیجیں گے اور مجھے خود بھی پولیس کی چوکی پر جانا پڑے گا، جو میوزیم کے قریب واقع تھی۔ بیگ میں میرا پاسپورٹ، ہوائی جہاز کا ٹکٹ، شہر کا نقشہ، ٹورسٹ گائیڈ بک، ڈائری، جس میں پتے اور فون نمبر درج تھے اور کچھ دوسری چیزیں رکھی تھیں۔ کیمرہ میں نے کندھے سے لٹکایا ہوا تھا۔ ٹریولر چیک اور نقد پونجی ایک بٹوے میں محفوظ تھے، جسکو میں نے اپنی کمر کے گرد باندھ رکھا تھا۔

پولیس کی چوکی پر زبان کی مشکل کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ جتنی زبانیں مجھے آتی ہیں اور انکی تعداد نصف درجن سے بڑھ کر ہے، ان میں سے ایک زبان بھی پولیس کے کارندوں کو نہ آتی تھی۔ وہ یونانی زبان بولنے پر مصر تھے، جس کا انہیں حق پہنچتا ہے۔ بالآخر وہ اپنے ایک ساتھی کو کسی دوسری چوکی سے بلانے میں کامیاب ہو گئے، جو مصر میں پیدا ہوا تھا، جہاں پر پہلے وقتوں میں اچھی خاصی یونانی کالونی پائی جاتی تھی۔ اسے ٹوٹی

پھوٹی عربی آتی تھی۔ اتنا بھی غنیمت تھا۔ اس نے رپورٹ درج کر لی، مگر بتایا کہ میرے بیگ کی بازیابی کی امید نہیں کی جا سکتی۔ چور نے یقیناً اپنے کام کی چیزیں نکالنے کے بعد بیگ کو کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دیا ہوگا۔ پاسپورٹ کو وہ آگے بیچ دے گا۔ البتہ مجھے اس امر کی اطلاع جرمن سفارت خانے کو کر دینی چاہیئے اور ہوائی کمپنی کو ٹکٹ کے چوری ہو جانے کے بارے میں بتا دینا چاہیئے تاکہ وہ اپنے عملہ کو چوکس کر سکیں۔

پولیس کی وین مجھے جرمن سفارت خانے پر چھوڑ آئی۔ قونصلر سیکشن کا متعلقہ شخص اپنے کمرے میں موجود نہ تھا، اسلئے مجھے ویٹنگ روم میں انتظار کرنے کا کہا گیا۔ میں وہاں پر بیٹھا ہوا اخبار کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ جرمن سفیر انتظار گاہ کے سامنے سے گذرا۔ مجھے لگا کہ میں اسے جانتا ہوں۔ مگر پیشتر اسکے کہ میں کچھ کہتا، وہ خود انتظار گاہ میں آ گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ مصافحہ کیلئے میری طرف بڑھایا اور پوچھا: "ہیلو منیر تم یہاں کیسے؟"

مجھے اس کی آواز مانوس لگی، مگر مجھے اپنی بصری یادداشت کے کسی کونے کھدرے میں اس کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔ میں لوگوں کے چہروں کے نقوش کو بہت جلد بھول جاتا ہوں۔ البتہ ان کی باتیں میرے ذہن میں اٹکی رہ جاتی ہیں اور میں کسی کمپیوٹر کی طرح ان کی پوری فائل نکال سکتا ہوں۔ مگر وہ شخص کون تھا، جو مجھ سے اس طرح دوستانہ شفقت کے ساتھ پیش آ رہا تھا۔

"تم نے مجھے نہیں پہچانا؟" اس نے تعجب کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہے کہ جناب کون ہیں"۔ میں نے جواب دیا۔

"میں تھوماس ہوں، جس کے ساتھ تمہاری ہمبرگ یونیورسٹی کے زمانے میں دانتوں کاٹی دوستی ہوا کرتی تھی"۔

"کون؟ تھوماس شلر؟ نہیں یہ کیسے ممکن ہے؟" مجھے اعتبار نہیں آ رہا تھا

"بالکل وہی، جس کو تم عربی پڑھایا کرتے تھے"۔

"تھوماس تو بہت ہونق شخص تھا، جبکہ تم اچھے خاصے معزز آدمی لگتے ہو"

"میں وہی ہونق ہوں، جو مہینوں تک اپنے بال نہیں کٹواتا تھا اور پیوند لگی ہوئی جینز

پہنتا تھا اور جس کو تم نے " جرمن فقیر " کا نام دے رکھا تھا " ۔

یہ ان دنوں کی بات تھی ، جب میں پانچویں دہائی کے اوآخر میں ہمبرگ یونیورسٹی میں داخل ہوا تھا اور ابھی جرمن زبان سیکھ رہا تھا ۔ ایک روز کیفے ٹیریا میں تھوماس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میں اسے عربی پڑھا سکتا ہوں ۔ میں نے کہا کہ میں عربی جانتا ہوں اور اسے پڑھا سکتا ہوں ، مگر وہ مجھ سے اردو کیوں نہیں سیکھتا ۔ اس پر تھوماس نے بتایا کہ وہ قانون پڑھ رہا تھا اور تعلیم کے خاتمے پر فارن سروس میں جانا چاہتا تھا ۔ اس نے سوچا تھا کہ عربی سیکھ کر ایک زائد کوالی فیکیشن پیدا کی جائے ۔ اس کو پتہ تھا کہ اردو کا چلن صرف برصغیر ہندو پاک میں تھا ، جہاں پر یوں بھی ہر کوئی انگریزی بولنے کو ترجیح دیتا ہے ۔ جب کہ عرب ملکوں کی تعداد بیس بائیس کے لگ بھگ ہے اور وہاں پر لوگوں کو انگریزی کم ہی آتی ہے ۔ میں نے اس کو عربی پڑھانے کی ہامی بھر لی ، مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ بدلے میں میرے جرمن مضامین کی تصحیح کیا کرے گا ۔

ہم ہفتہ میں ایک روز ملتے تھے ۔ پہلے عربی سبق ہوتا تھا ۔ پھر اسے میرا اس ہفتہ میں لکھا جانے والا مضمون دیکھنا ہوتا تھا ۔ تھوماس زبان سیکھنے کی حد تک کند ذہن واقع ہوا تھا ۔ اس نے عربی رسم الخط سیکھنے میں مہینے لگا دیئے ، جب کہ میری دسترس جرمن زبان پر دن بدن بہتر ہوتی جا رہی تھی ۔ میں جرمن زبان کی کلاسیں اٹنڈ کرتا تھا ۔ دو تین گھنٹے روزانہ اخبار پڑھنے میں لگا دیتا تھا ۔ ریڈیو کی نشریات کو باقاعدگی کے ساتھ سنتا تھا ۔ زبان سیکھنے کے سلسلہ میں ٹیلی ویژن بہت حد تک مدد ثابت ہوسکتا ہے ، مگر ان دنوں میں ٹیلی ویژن میری پہنچ سے باہر تھا ۔ یوں بھی اس زمانے میں ٹیلی ویژن اکا دکا گھروں میں پائے جاتے تھے ، جن میں بلیک اینڈ وائٹ فلمیں دکھائی جاتی تھیں ۔

تھوماس اچھے خاصے کھاتے پیتے گھرانے کا سپوت تھا ۔ وہ لوگ ہمبرگ سے باہر ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتے تھے ، جسکے بارے میں تھوماس کہا کرتا تھا کہ اس گاؤں میں انسانوں سے زیادہ گائیں پائی جاتی ہیں ۔ ان میں وہ لڑکیوں کو بھی شمار کیا کرتا تھا ۔ صرف ایک لڑکی کرستینا کا استثناء تھا ، جسکے بارے میں اسکا کہنا تھا کہ وہ اتنی خوبصورت ہے کہ تم اسے دیکھ لو ، تو فوراً اس پر عاشق ہو جاؤ ۔ میں نے کئی بار کہا کہ وہ کرستینا کو ہمبرگ لائے ، تاکہ ہم اسکو دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں ۔ مگر اسکا کہنا تھا کہ اس

بارے میں وہ کٹر مسلمان ہے اور نہیں چاہتا کہ اسکے سوا کوئی دوسرا کرستینا کے حسن و جمال کو دیکھے۔

انہی دنوں میں تھوماس نے طالب علموں کی ایک انجمن کو جائن کرلیا، جس کی بنیاد انیسویں صدی میں رکھی گئی تھی۔ ابتداء میں ایسی انجمنوں کا مقصد جرمن قوم کو بیدار کرنا اور ملک میں رائج طوائف الملوکی کو ختم کرنا تھا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان انجمنوں کا تعلق نازی پارٹی کی آئیڈیالوجی سے تھا۔ دراصل نازی حکومت کے زمانے میں یہ انجمنیں جبراً بند کر دی گئی تھیں۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد آہستہ آہستہ پھر ان انجمنوں نے اپنا سر اٹھایا تھا۔ مگر اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں ہے کہ ان انجمنوں نے اپنی افادیت عرصہ ہوا کھو دی تھی۔ بعض لوگ سانپ کے نکل جانے کے بعد اس کی لکیر کو پیٹ کر خوش ہوتے ہیں۔ یہی حال تھوماس کی انجمن کا تھا۔ انجمن کی اپنی بلڈنگ تھی، جس میں ممبروں کی رہائش کے لئے چند کمرے مخصوص تھے۔ تھوماس وہاں پر جا کر رہنا چاہتا تھا، مگر اس کا باپ اجازت نہیں دیتا تھا، کیونکہ اسے پتہ تھا کہ وہاں پر شراب نوشی کا رواج تھا، جس کی وجہ سے تعلیم کا حرج ہونے کا خطرہ تھا۔ پھر وہاں پر شمشیر زنی سکھائی جاتی تھی، جس کی مشق کے دوران چہرے پر زخم لگنے کا امکان پایا جاتا تھا۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ ان انجمنوں کے ممبر ایسے زخموں پر فخر کرتے تھے۔ یہ ان کے لئے آئندہ زندگی میں ایک طرح سے امتیازی نشان بن جاتا تھا۔ تھوماس بھی چاہتا تھا کہ کسی روز اس کی گال پر ایک ایسا آڑا ترچھا زخم لگ جائے۔ اس لئے وہ باقاعدگی سے شمشیر زنی کی ٹریننگ میں حصہ لیتا تھا۔ پھر اس نے شراب نوشی شروع کر دی۔ بعض اوقات وہ دو تین ہفتوں تک عربی پڑھنے بھی نہیں آتا تھا۔ پہلے تو میں باقاعدگی سے مقررہ وقت پر کیفے ٹریا میں جاتا رہا۔ مگر جب اس کا ناغہ حد سے بڑھنے لگا، تو میں نے بھی جانا چھوڑ دیا۔

ایک روز تھوماس مجھے ڈھونڈتا ہوا میرے ہوسٹل میں آ نکلا۔ وہ آخری دو سمسٹروں کے لئے ٹیوبنگن یونیورسٹی جا رہا تھا۔ اس لئے جانے سے پہلے ایک دعوت دے رہا تھا، جس میں میری شرکت ضروری تھی۔ اس کے باپ کو مجھ سے ملنے کا شوق تھا، کیونکہ تھوماس اسے میرے بارے میں بتاتا رہا تھا۔ تھوماس نے کہا کہ اس کا دوست روڈولف اور کرستینا بھی آ رہے ہیں۔

تھوماس کے باپ کے بارے میں مجھے پتہ تھا کہ وہ نازی پارٹی کا ممبر رہا تھا اور اسپین میں اس نے جنرل فرانکو کی فوج میں شامل ہوکر جمہوریت کے حامیوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا تھا۔ وہ نازی پارٹی کی ایس ایس فوج کا ممبر رہا تھا، جس کی طرف سے اس کو فرانس میں تعینات کیا گیا تھا، جہاں پر وہ فرانسیسی انڈرگراونڈ کے ایک حملے میں زخمی ہوا تھا اور اس کی ایک ٹانگ کاٹنی پڑی تھی۔ تھوماس کا کہنا تھا کہ اس کے باپ کی ٹانگ کا کٹنا اس کے حق میں بہت مفید ثابت ہوا تھا، کیونکہ اس وجہ سے اسے دوسری عالمگیر جنگ میں محاذ پر نہیں لڑنا پڑا تھا اور نہ ہی جنگ کے خاتمہ پر جنگی قیدی بننا پڑا تھا۔

" تمہارا باپ تو مجھے ملنا چاہتا ہے، مگر کیا کرستینا بھی مجھ سے ملنا چاہتی ہے؟" میں نے اسے چھیڑنے کے لئے کہا۔

" یہ بات تم خود اس سے پوچھ لینا۔ مگر یہ نہ سمجھنا کہ میں اسے تمہارے سپرد کر کے جاؤں گا۔ تم میرے نزدیک قابل اعتبار آدمی نہیں ہو"۔ تھوماس نے آنکھیں مچکاتے ہوئے کہا۔

تھوماس اور کرستینا مجھے لینے کیلئے ریلوے اسٹیشن پر آئے ہوئے تھے۔ کرستینا کی خوبصورتی کے بارے میں تھوماس نے غلط بیانی نہیں کی تھی۔ اسکے نقش بہت دلفریب تھے اور چہرے پر فرشتوں والی معصومیت کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ تھوماس نے کرستینا کا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا، جیسے اسے خطرہ ہو کہ کہیں کوئی اس سے کرستینا کو چھین نہ لے۔ ہمیں لیوبک سے آنے والی گاڑی کا انتظار کرنا تھا، جس میں روڈولف آرہا تھا۔ کرستینا نے انہی دنوں میں جمنازیم میں فائینل امتحان پاس کیا تھا اور ہمبرگ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کا ارادہ رکھتی تھی۔ تھوماس نے بہت زور لگایا تھا کہ وہ اسکے ساتھ ٹیوبنگن چلے، مگر کرستینا کے ماں باپ نے اجازت نہ دی تھی۔ میں نے ان کی رائے کی تائید کی اور کہا:

" تھوماس ٹیوبنگن جا رہا ہے، تاکہ ماں باپ کی نگرانی سے نکل کر خوب پی پلا سکے۔ تم کو یہ اس لئے ساتھ لے جانا چاہتا ہے کہ اس کو ایک نرس کی ضرورت ہوگی، جو اس کی دیکھ بھال کر سکے اور جب یہ صاحب بہادر نشے میں چور کسی گلی کوچے میں پڑا ہوگا، تو اس کو سہارا دے کر گھر پہنچا سکے اور اس کے بستر پر نشہ اترنے تک پہرہ دے سکے"۔

اتنے میں لیوبک والی ٹرین آ گئی۔ میں روڈولف کو جانتا تھا۔ وہ تھوماس کے

ساتھ قانون پڑھتا تھا۔ بعض اوقات جب تھوماس عربی کا سبق لینے کے لئے مجھ سے کیفے ٹریا میں ملتا تھا، تو روڈولف بھی اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ مگر اسے فارن آفس میں کام کرنے کی خواہش نہ تھی۔ وہ اپنے باپ کی طرح وکیل بننا چاہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ سرکاری نوکری میں انسان امیر نہیں بن سکتا اور وہ ہر قیمت پر امیر بننا اور اپنے باپ کی طرح اونچے پیمانے کی زندگی بسر کرنی چاہتا تھا۔ قانون کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ ایک دو سال کے لئے امریکہ جانا چاہتا تھا، جہاں کی ہر چیز اس کو بھاتی تھی۔ اس کا بس چلتا، تو وہ ساری زندگی کو امریکیوں کی طرح بسر کرتا۔ مگر اس کا باپ ان کاؤبوائز کو پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ آدمی کو چاہیئے کہ ان کو قریب نہ پھٹکنے دے۔ ان کو ایک بازو کے فاصلے پر رکھے۔ ہم روڈولف کو مذاق میں کاؤبوائے کہہ کر پکارتے تھے۔

تھوماس کے ماں باپ ہماری راہ تک رہے تھے۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ اس روز خاص طور پر میری خاطر دنبے کا گوشت پکایا گیا تھا۔ کھانا مزیدار تھا، جس کے دوران تھوماس کا باپ مجھ سے کرید کرید کر پاکستان کے حالات پوچھتا رہا، جس کے بارے میں اسے صرف اتنا پتہ تھا کہ وہ برصغیر ہندوستان کا حصہ ہے۔ کچھ عرصہ پہلے جنرل ایوب خان جرمنی کا دورہ کر کے گیا تھا۔ اسکے جسمانی ڈیل ڈول سے لوگ بہت متأثر ہوئے تھے اور اسبات کو نظر انداز کر بیٹھے تھے کہ وہ ملٹری ڈکٹیٹر تھا اور جمہوریت پر شب خون مارنے کا مرتکب ہوا تھا۔ اس زمانے میں جرمنوں کو جمہوریت سکھائی جا رہی تھی۔ تعلیمی اداروں میں خاص طور پر کورس پڑھائے جاتے تھے۔ اسکے علاوہ بے شمار تعلیم بالغاں کے اداروں میں سمینار منعقد ہوتے تھے۔ یونیورسٹی میں طالب علموں کی یونین نئی نئی بنی تھی، جسکے انتخابات میں میں بھی امیدوار تھا۔ بلکہ مجھے دوسروں سے بڑھ کر ووٹ ملے تھے، جسکے سبب مجھے یونین کا عہدہ قبول کرنیکی پیشکش کی گئی تھی۔ میں نے کسیقدر تذبذب کے بعد غیر ملکی طالب علموں کے معاملات کا چارج لیا تھا۔ مگر بہت جلد یہ دیکھ کر مایوس ہوا تھا کہ طالب علم پارلمان کی کاروائی میں کچھ ایسی دلچسپی نہ لیتے تھے۔ یونین کے اجلاس اتنے مایوس کن ہوتے تھے کہ میں نے ان میں شرکت کرنی چھوڑ دی تھی۔ تھوماس کے باپ نے جاننا چاہا کہ میں طالب علموں میں کس قسم کی بیداری چاہتا تھا۔

" ملکی اور غیر ملکی سیاسیات میں دلچسپی"۔ میں نے جواب دیا: " میرے نزدیک اتنا

کافی نہیں ہے کہ یونین کے اجلاسوں میں محض اس بات پر بحث ہو کہ سردیوں کے سمسٹر میں ہونے والی پارٹی پر کتنا خرچ ہوا تھا اور گرمیوں کے سمسٹر کی پارٹی میں کن موسیقاروں کو بلایا جائے گا"۔

" چچا، دراصل یہ امریکیوں کی ویت نام میں دخل اندازی پر بحث کرنی چاہتا ہے۔ حالانکہ ساری دنیا جانتی ہے کہ وہ وہاں پر ہماری آزادی اور جمہوریت کے لئے لڑ رہے ہیں"۔ روڈولف نے کہا۔

" ہماری آزادی اور جمہوریت کی خاطر جنگ؟ یہ محض ڈھکوسلا ہے" مجھ سے نہ رہا گیا: " سیدھے سیدھے کیوں نہیں کہتے ہو کہ وہ جنوبی ویت نام کی بدمعاش لیڈرشپ کی گدی کی خاطر خون خرابا کر رہے ہیں"۔

" اگر امریکن فوج نہ ہوتی، تو اب تک ویت نام پر سرخ جھنڈا لہرا رہا ہوتا" تھوماس نے اپنے دوست کی مدد کرنے کی خاطر کہا۔

" اگر ویت نام کے عوام کی اکثریت کمیونسٹ نظام چاہتے ہیں، تو امریکی ان کی مرضی کے خلاف فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہیں؟" میں نے کہا۔

تھوماس کے باپ کا خیال تھا کہ امریکیوں نے کوریا اور ویت نام کی جنگوں میں حصہ نہ لیا ہوتا، تو جنوبی ایشیا کبھی کا پکے ہوئے سیب کی طرح کمیونسٹوں کی جھولی میں جا گرتا۔ اس نے کہا کہ وہاں پر کمیونسٹوں کو کامیابی ہوگئی، تو پھر یورپ میں کوئی طاقت انکے سامنے کھڑی نہ ہو سکے گی۔ اس زمانے میں یوں بھی آدھا یورپ ان کے ہاتھ میں تھا، جہاں پر کسی کو دم مارنے کی بھی جرات نہ تھی۔

" کیا مغربی جرمنی میں کسی کو دم مارنے کی جرات ہے؟" کرستینا کا یہ سوال ہمارے لئے ایک اچنبے سے کم نہ تھا، کیونکہ اس کے بارے میں ہمارا خیال تھا کہ اسے سیاسیات میں بالکل کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

" مغربی جرمنی میں جمہوریت کا دور دورہ ہے" تھوماس نے جواب دیا: " یہاں پر انفرادی انسانی آزادی کا حترام کیا جاتا ہے"۔

" ریل گاڑی کے اس انجن ڈرائیور کے بارے میں تم کیا کہتے ہو، جس کو اس وجہ سے نوکری سے نکال دیا گیا ہے کہ وہ کمیونسٹ پارٹی کا ممبر ہے"۔ کرستینا نے پوچھا۔

مجھے کئی ایک کیسوں کا پتہ تھا۔ میرے جاننے والوں میں ایک نوجوان شامل تھا، جس کو اس وجہ سے اسکول میں استاد کی اسامی پر نہ لیا گیا تھا کہ وہ طالب علمی کے دنوں میں بائیں بازو کی ایک جماعت کا سرگرم رکن رہ چکا تھا۔ کرستینا نے اپنے جمنازیم اسکول کے ایک ٹیچر کے بارے میں بتایا، جسے دو سال کی ٹریننگ کے خاتمے پر ملازمت سے نکال دیا گیا تھا، کیونکہ اس کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ وہ طالب علموں کے دلوں میں باغیانہ خیالات پیدا کرنے کا مرتکب تھا۔ اس وجہ سے کرستینا کے اسکول میں طالب علموں نے ہڑتال کر دی تھی۔ دو ہفتوں کے بعد محکمہ تعلیم کا اپنا حکم واپس لینا پڑا تھا۔

پھر ہماری بحث کا رخ اس طرف مڑ گیا کہ اگر امریکیوں کو فردی آزادی کا اتنا پاس ہے، تو وہ اپنے ملک میں سیاہ فام باشندوں کو کیوں برابر کے حقوق نہیں دیتے۔ اس زمانے میں امریکہ کی جنوبی ریاستوں کے مدارس میں رنگ ونسل کا امتیاز روا رکھا جاتا تھا۔ اور شہر میں چلنے والی اومنی بسوں میں کالوں کو الگ دروازے سے بس میں داخل ہونا اور پچھلی سیٹوں پر بیٹھنا پڑتا تھا۔ ان کا داخلہ سفید فاموں کے کلبوں اور شراب خانوں میں ممنوع تھا۔

روڈولف زور وشور سے امریکی طرز زندگی کا دفاع کرتا رہا، جس میں تھوماس بھی تھوڑا بہت اس کا ساتھ دیتا رہا۔ دوسری طرف کرستینا کھل کر میری سائیڈ لینے لگی۔ اس نے جنوبی افریقہ کی سفید فام حکومت کی نسلی امتیاز کی پالیسی پر تنقید شروع کر دی۔ تھوماس کا باپ، جو ابتداء میں ہماری بحث میں حصہ لیتا رہا تھا، اب بالکل چپ ہو گیا اور خاموشی کے ساتھ ہماری بحث کو سننے لگا، جو کھانا ختم ہونے اور کافی کا دور چلنے کے بعد گاؤں کی سیر کے دوران جاری رہی۔ بلکہ جوں جوں وقت گذرتا گیا، اس میں شدت آتی گئی۔ ہماری واپسی کے وقت اس نے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ ہم دس برسوں کے بعد پھر اسکے گھر پر اکٹھے ہوں، تاکہ پتہ چلے کہ اس عرصے میں ہمارے خیالات میں کیا تبدیلی آئی تھی۔

تھوماس کے ٹیوبنگن چلے جانے کے بعد ہمارا رابطہ ٹوٹ گیا۔ البتہ کرستینا گاہے گاہے یونیورسٹی میں نظر آنے لگی۔ اس کی زبانی پتہ چلا کہ تھوماس نے قانون کا امتحان پاس کر لیا تھا اور میونخ کی عدالت میں اپرنٹس شپ کر رہا تھا۔ اس کے بعد وہ کیا کرتا رہا

تھا، اس بارے میں مجھے کچھ خبر نہ تھی۔ تین دہائیوں کے بعد اس سے ایتھنز میں مل کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ تھوماس نے سفارت خانہ کے فرسٹ سیکریٹری کو میرے کوائف دیئے اور میرے لئے ٹریولنگ ڈاکومنٹ تیار کرنے اور لفت ہانزا کو ٹکٹ کی چوری ہو جانے کی اطلاع کرنے کی ہدایت کی۔ پھر وہ مجھے دوپہر کے کھانے کے لئے اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ اس کی بیوی یولانڈا نے کسی بچھڑے ہوئے دوست کی طرح میرا استقبال کیا۔ اس نے بتایا کہ اس نے اپنے خاوند کی زبانی میرا ذکر سن رکھا تھا۔ تھوماس نے کہا کہ عرب سفیر اسکی عربی رسم الخط پڑھ سکنے کی قابلیت سے بہت متأثر ہوتے تھے۔ اس نے بتایا کہ ہمبرگ سے چلے جانے کے بعد ایک آدھ برس تک اسے کرستینا کی زبانی میرے بارے میں خبریں پہنچتی رہی تھیں۔ پھر یہ سلسلہ بند ہو گیا۔

کرستینا نے ہمبرگ یونیورسٹی میں جرمن اور انگریزی ادبیات کے مضامین پڑھائی کے لئے چنے تھے۔ مگر اس کا اکثر وقت بائیں بازو کی جماعتوں کے ہنگامی پروگراموں میں گذرتا تھا۔ یہ لوگ ان دنوں بہت فعال تھے اور آئے دن سمینار اور جلسے جلوس کراتے رہتے تھے۔ کرستینا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ سپارٹاکس گروپ میں شامل ہو گئی تھی، جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ لوگ احتجاجی جلسے جلوس نکالنے کی بجائے ہنگامے برپا کرنے کو ترجیح دیتے تھے اور چیزوں کی توڑ پھوڑ کو جائز سمجھتے تھے۔ جس کے سبب ان کا واسطہ آئے دن پولیس سے پڑتا تھا۔ کرستینا نے ہوسٹل کو چھوڑ دیا تھا اور ایک فلیٹ میں منتقل ہو گئی تھی، جس کے پانچ کمروں میں پانچ انقلابی رہتے تھے۔ کرستینا کا کہنا تھا کہ اس طرح ہنگامی ایکشنوں کی پلاننگ میں آسانی رہتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک ایسا ایکشن یونیورسٹی کے اکیڈیمک سال کے افتتاحی جلسہ کے خلاف کیا گیا تھا۔ اس تقریب کی کاروائی تھی ہی بے حد مضحکہ خیز۔ ایڈیٹوریم کے طالب علموں سے بھر جانے کے بعد پروفیسران کالے چوغوں میں ملبوس اور سر پر کالے ہیٹ رکھے ہوئے دو رویہ قطار میں بطخوں کی چال چلتے ہوئے ہال میں داخل ہوتے تھے، جسکا استقبال حاضرین تالیاں بجا کر کرتے تھے۔ اس سال جب جلوس ہال میں داخل ہونے لگا، تو بائیں بازوں کے دو طالب علم دروازے پر ایک بینر لئے ہوئے کھڑے تھے، جس پر لکھے ہوئے سلوگن کو ان کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ فوراً جلوس کے آگے آگے چلنے لگے۔ ان کے بینر پر لکھا ہوا

تھا: "چوغوں میں بند، ہزار سال کا گند"۔ واضح کے کہ اس سلوگن کو پڑھ کر ہال میں ہنسی اور ٹھٹھے کا ایک طوفان برپا ہوگیا۔ اس دن سے جرمن یونیورسٹیوں میں پروفیسروں نے ایسی تقریبات میں کالے چوغے اور زمانہ ہائے وسطی کے مضحکہ خیز ہیٹ پہننے چھوڑ دیئے۔

مغربی جرمنی کا معاشرہ اس زمانے میں کمیونسٹ بلاک اور مغربی طاقتوں کے درمیان چکی میں پڑے ہوئے گیہوں کی طرح پس رہا تھا۔ سرد جنگ کے اثرات اس ملک پر دوسرے سارے یورپی ملکوں سے زیادہ نظر آتے تھے۔ اس لئے جب مغربی جرمنی کی پارلمان میں ایمرجنسی کے قانون پر غور وخوض کیا جانے لگا، کیونکہ ایسی اضطراری صورت حال پیدا ہوسکتی تھی، تو بائیں بازو کے طالب علم اس کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے۔ شروع کے پر امن مظاہرات دن بدن شدت اختیار کرتے گئے۔ طالب علموں کے ریڈیکل گروپوں کا خیال تھا کہ وقت انقلاب کے لئے موزوں ہے اور مسلح جد و جہد کو فوری طور پر شروع کرنا چاہیئے۔ چنانچہ یہ لوگ انڈر گراونڈ میں چلے گئے۔ یہ کام اتنی خاموشی اور رازداری کے ساتھ ہوا کہ طالب علموں کے دوستوں اور رشتہ داروں کو بھی پتہ نہ چلا کہ وہ لوگ کہاں پر غائب ہو گئے تھے۔ میں بہت روز تک کرستینا کے گھر پر فون کرتا رہا، مگر وہاں سے کوئی جواب نہ ملا، کیونکہ کسی نے فون نہ اٹھایا۔ مہینہ بھر بعد فون کٹ گیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ نقل مکانی کر گئے تھے۔ انہی دنوں میں ایک گروپ "ریڈ آرمی فریکشن" (RAF) کی طرف سے بلٹین نکلنے لگے، جس میں امپیریل ازم کے خلاف جنگ کا اعلان کیا جانے لگا۔

اس کا عملی مظاہرہ سیاستدانوں اور کارخانہ داروں پر مسلح حملوں اور ان کو اغوا کرنے کی صورت میں ہونے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے RAF ایک غیر قانونی گینگ میں بدل گئی، جس کے ممبران کو اشتہاری ملزم قرار دے دیا گیا۔ میں انہی دنوں میں اپنی تعلیم کے خاتمے پر ہوسٹل کو چھوڑ کر ایک فلیٹ میں منتقل ہوگیا تھا، جو پانچویں منزل پر چھت کے نیچے واقع تھا۔ میرا سارا دن باہر گذرتا تھا اور میں کہیں رات گئے واپس لوٹتا تھا۔ ایک روز میں آدھی رات کے لگ بھگ گھر آیا، تو دیکھا کہ کرستینا دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر سو رہی تھی۔ پتہ چلا کہ وہ انڈر گراونڈ میں تھی اور پولیس سے چھپتی پھرتی تھی۔ تاہم اس نے اس وقت تک کسی قسم کے مجرمانہ ایکشن میں حصہ نہیں لیا تھا۔ وہ میرے پاس ایک مہینہ

رہی ، جس کے دوران ہم دن رات سیاسی معاملات پر بحث کرتے رہے اور میں نے پوری پوری کوشش کی کہ وہ اس طریق کو خیر باد کہہ دے، جس کا معاشرے کو یا اسے ذاتی طور پر کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ انہی دنوں میں ایک دوسرے بائیں بازو کے گروپ نے اعلان کیا تھا کہ وہ سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے نظام کو بدلنے کے لئے اس کے اداروں میں انفلٹریٹ کریں گے۔ انہوں نے دوسرے ہم خیال لوگوں کو دعوت دی کہ اس طریق کو اختیار کر کے ریاست کو اندر سے بدلنے کی کوشش کریں۔ یہ چیز اور میرے سارے دوسرے دلائل کرستینا کو قائل نہ کر سکے۔ جس طرح وہ اپنی مرضی سے آئی تھی، اسی طرح وہ ایک روز میرے فلیٹ کو چھوڑ گئی۔ مجھے بالکل پتہ نہیں ہے کہ وہ میرے پاس آنے سے پہلے کہاں پر رہتی تھی اور وہاں سے چلے جانے کے بعد کدھر گئی تھی۔

میری زبانی یہ کوائف سن کر تھوماس نے بتایا کہ کرستینا ہمبرگ سے رخصت ہو کر لبنان چلی گئی تھی، جہاں پر RAF نے PLO کے ساتھ اپنے ممبروں کو اسلحہ کی ٹریننگ دینے کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ اسکو اس بات کو علم اس وقت ہوا، جب وہ لبنان میں سفیر بن کر گیا۔ سیکریٹ سروس کی اطلاع کے مطابق کرستینا وہاں پر تین ماہ تک رہی تھی۔ خیال کیا جاتا تھا کہ اس کے بعد وہ جرمنی واپس لوٹ گئی تھی، مگر کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں پر غائب ہوگئی تھی۔ کرستینا کے ماں باپ کو بھی اس کی کوئی خبر نہ تھی۔

ہم کھانے کے بعد سفارت خانہ میں پہنچے، تو میرا ٹریولنگ ڈاکومنٹ تیار تھا اور لفت ہانزا کی طرف سے نیا ٹکٹ بھی آیا پڑا تھا۔ میں اسی شام کی فلائیٹ سے جرمنی کے لئے پرواز کر گیا، جہاں پر میری زندگی اپنی سابقہ ڈگر پر چلنے لگی، جس میں تھوماس کو یاد کرنے یا کرستینا کی گمشدگی پر سر توڑنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ ہوسکتا ہے کہ میں نے یہ کہانی کبھی نہ لکھی ہوتی اگر مجھے حال میں ہی سابقہ مشرقی جرمنی میں واقع ہالے یونیورسٹی کی طرف سے ایک لیکچر کی دعوت نہ ملتی۔

لیکچر کے سامعین کی حاضری غیر معمولی طور پر اچھی تھی، جس میں طالب علموں کے علاوہ اچھی خاصی تعداد میں دوسرے شہری بھی شامل تھے۔ لیکچر شام کو رکھا گیا تھا، جس کے بعد سوالات و جوابات کا سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔ میں کہیں آدھی رات کو ہوٹل میں پہنچا۔ مجھے اگلی صبح گیارہ بجے کی گاڑی لینی تھی۔ اس لئے میں ناشتہ کرنے کے بعد

کتابوں کی دوکان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ سابقہ مشرقی جرمنی میں کتابیں بہت عمدہ چھاپی جاتی تھیں، جن کی قیمتیں نہایت مناسب ہوتی تھیں۔ ہوٹل میں مجھے بتایا گیا تھا کہ پرانی کتابوں کی ایک دوکان قریب ہی پائی جاتی ہے، مگر لوگ اب ان کتابوں کی طرف کم ہی توجہ دیتے ہیں۔ چنانچہ جب میں دوکان میں داخل ہوا، تو وہاں پر میرے سوا اور کوئی خریدار نہ تھا۔ میں نے دوکان کی اٹنڈنٹ لیڈی سے برتھولٹ بریشٹ کا کامل دیوان دکھانے کو کہا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک ریک کی طرف گئی، مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ بار بار گھوم کر مجھے گھور رہی تھی۔ جب وہ دیوان کی چاروں جلدیں لے کر واپس لوٹی، تو اس نے کہا کہ وہ مجھے ہمبرگ سے جانتی ہے۔ میں نے اس کے نام کی تختی پر نظر ڈالی۔ اس پر کلاوڈیا پٹروسکی لکھا ہوا تھا۔

"آپ کا نام میرے لئے بالکل اوپرا ہے" میں نے کہا۔

"کیا آپ کو کرستینا ہالباخ کا نام یاد ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ضرور یاد ہے، مگر اس کے ساتھ آپ کا کیا تعلق ہے؟"

"میرا اس سے یہ تعلق ہے کہ میں پہلے جنم میں کرستینا ہالباخ تھی۔ کلاوڈیا میرا نیا نام ہے اور پٹروسکی میرے خاوند کا نام ہے، جس کے ساتھ میں نے مشرقی جرمنی آنے کے بعد شادی کر لی تھی"۔

پتہ چلا کہ کرستینا بیروت سے واپسی پر سیدھی مشرقی برلن گئی تھی، کیونکہ مغربی جرمنی میں وہ اشتہاری مجرم قرار دی جا چکی تھی اور اس کے سر پر انعام رکھا گیا تھا۔ مشرقی جرمنی کی خفیہ پولیس نے اس کو نیا نام اور نئی شناخت دے دی تھی۔ مگر کرستینا کو پتہ ہے کہ مغربی اور مشرقی جرمنی کے متحد ہو جانے کے باوجود سرکاری وکیل اس کی تلاش میں ہے۔ اور یہ کہ ابھی اسے اپنے ماضی کا سامنا کرنا پڑے گا، جو کسی بھی روز اس کو آ لے گا۔

(کمر فیلڈ۔ ۲۴ مئی ۱۹۹۸ء)

ولی اللہ

ادیس ابابا بیک وقت ایک میگا شہر اور ایک بے ڈھنگا گاؤں ہے۔ میرے لئے چند روز کے اندر اس کا حدود اربعہ جاننا مشکل تھا۔ اس لئے مجھے یقین نہیں تھا کہ میں اپنے جامعہ کے زمانے کے دوست رضوان عبداللہ کے خاندان کو ڈھونڈ سکوں گا۔ مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ تلاش کو کس سرے سے شروع کیا جائے۔ میں صرف یہ جانتا تھا کہ رضوان کے باپ کا نام عبداللہ فیصل تھا، جو سوڈان کا رہنے والا تھا، مگر ایک عمر سے ادیس ابابا میں مقیم تھا اور قط کا کاروبار کرتا تھا۔ یہ کوائف بھی تیس پینتیس سال پرانے تھے، جب میں احمد نگر کے جامعہ میں پڑھتا تھا، جہاں پر رضوان کے ساتھ میری دوستی تھی۔ ہمارے تعلقات بھائیوں جیسے تھے۔

ایک شام مصر کے سفیر ابوبکر عبدالقادر نے مجھے کھانے پر بلایا۔ انہوں نے رخصت کے وقت پوچھا کہ کیا میں اگلے روز نماز جمعہ کی ادائیگی کے لئے جامع مسجد میں جانا چاہتا ہوں۔ میرا جواب اثبات میں پا کر انہوں نے کہا کہ سفارت خانہ کی کار مجھے لینے کے لئے ایک بجے ہوٹل پر پہنچ جائے گی۔ میں مقررہ وقت پر وضو کر کے تیار بیٹھا تھا۔ اس روز مسجد میں تل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ کئی ہزار نمازی جمع تھے۔ اکثر لوگوں نے ہاتھوں میں ایک پودے کی شاخیں اٹھایا اپنے عماموں میں اڑس رکھی تھیں، جن پر لگے ہوئے سفید پھول نہایت عمدہ خوشبو دے رہے تھے۔ مسجد کے گیٹ پر ہم جیسے لوگوں کو، جو شاخوں کے بغیر تھے، شاخیں مفت پکڑائی جا رہی تھیں۔ میں نے اس وقت تک قط کا پودا نہیں دیکھا تھا، جس کا ذکر سفیر صاحب نے دعوت کے دوران کیا تھا اور بتایا تھا کہ قط کی مجلسیں پچھلے پہر لگتی ہیں اور آدھی رات تک جاری رہتی ہیں۔ لوگ قط کے پتوں کو منہ میں ڈال کر پان کی طرح چباتے ہیں۔ اس میں سے نکلنے والا رس انسانی دل و دماغ پر خاص اثر کرتا ہے اور حافظہ میں حیرت انگیز طور پر وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ جامع مسجد میں لوگوں کے ہاتھوں میں شاخیں دیکھ کر میں نے سفیر صاحب سے پوچھا کہ کیا وہ قط کے پودے کی

شاخیں ہیں ۔ انہوں نے نفی میں سر ہلایا اور بتایا کہ لوگ نماز جمعہ کے بعد قط خریدنے کے لئے جاتے ہیں ، جس کا بازار جامع مسجد کے پہلو میں ہے ۔ میں نے کہا کہ میں ایک قط فروش عبداللہ فیصل کی تلاش میں ہوں ۔ جو سوڈان کا رہنے والا ہے ۔ انہوں نے جواب دیا کہ اس کو تلاش کرنا کچھ ایسا مشکل نہیں ہونا چاہیئے ۔ ان کا ڈرائیور سارے قط فروشوں کو جانتا ہے ۔ وہ ضرور عبداللہ فیصل کو ڈھونڈ نکالے گا ۔

میری توقع کے برعکس رضوان کے باپ کا پتہ بہت آسانی کے ساتھ مل گیا ۔ عبداللہ فیصل کو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ان کے بیٹے رضوان کا دوست ان کے شہر میں آیا ہوا ہے اور ان سے ملنا چاہتا ہے ۔ انہوں نے ڈرائیور کے ذریعہ مجھے شام کو اپنے گھر پر آنے کی دعوت دی تاکہ میں رضوان کی والدہ اور بہن بھائیوں سے بھی مل سکوں ۔

•••••••

رضوان ایک خوش خلق اور خوش شکل لڑکا تھا ، جو خدا جانے کیسے تعلیم حاصل کرنے کے لئے پاکستان آ نکلا تھا ۔ وہ اپنے ماں باپ کا پلوٹھی کا بیٹا تھا ، جسے اس کے دادا نے جو خرطوم میں رہتے تھے ، اپنے بیٹے سے مانگ لیا تھا ۔ اس طرح رضوان کا بچپن سوڈان کے عرب ماحول میں گذرا تھا اور وہ عربی کے سوا کوئی دوسری زبان نہ جانتا تھا ۔ جب پاکستان جاتے ہوئے وہ ادیس ابابا میں اپنی ماں سے ملنے کے لئے رکا ، تو ماں بیٹا ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت نہیں کر سکتے تھے ۔ ماں کو صرف امہاری زبان آتی تھی ، جس سے رضوان ناواقف تھا ۔ اس کے باپ کو ان کے درمیان مترجم بننا پڑتا تھا ۔

رضوان کے ساتھ میری دوستی میں اس چیز کا بھی ہاتھ تھا کہ میں ان دنوں میں عربی پڑھ رہا تھا ۔ اسکے پاس مصر سے ہفتہ وار " المصور " اور ماہنامہ " الھلال " آتے تھے ، جن میں میری دلچسپی کے مضامین اور کہانیاں ہوا کرتی تھیں ۔ میں نے اس زمانہ میں عربی سے تراجم کرنے شروع کئے تھے ، جو لاہور کے ہفت روزہ " قندیل " میں چھپتے تھے ۔ بعض اوقات جب میں المنجد لغات کی مدد سے مشکل مقامات کو حل نہ کر پاتا تھا ، تو رضوان کی طرف رجوع کرتا تھا ۔ اس طرح میں اسکی مدد سے عربی سیکھ رہا تھا اور وہ میری مدد سے اردو ۔ رضوان تھوڑے عرصہ میں اتنی اچھی اردو سیکھ گیا کہ اگر وہ پردے کے پیچھے سے بولتا اور سامع اسکے حبشی چہرے کو نہ دیکھ سکتا ، تو کوئی نہ جان سکتا کہ رضوان غیر ملکی

ہے۔

رضوان بہت ہنس مکھ لڑکا تھا۔اس کے دماغ میں نت نئی شرارتیں جنم لیتی رہتی تھیں۔گرمیوں کے دنوں میں ہوسٹل کے لڑکے راتوں کو کھلے صحن میں سوتے تھے، جہاں پر دن کے وقت والی بال کھیلا جاتا تھا۔ہم دونوں اکثر رات کو حاضری لگنے کے بعد سیر سپاٹے کے لئے چپکے سے باہر نکل جاتے تھے۔جب ہم آدھی رات کے لگ بھگ واپس لوٹتے تھے، تو سب لوگ بے خبر سو رہے ہوتے تھے۔ایک رات رضوان کو یہ شرارت سوجھی کہ سونے والوں کے جوتے اٹھا کر ہوسٹل کی چھت پر قطار وار لگا دیئے جائیں۔ہم نے اپنے جوتے بھی قطار میں لگا دیئے، تاکہ اگلی صبح جب جوتوں کی تلاش شروع ہو، تو ہم پر شبہ نہ کیا جا سکے۔سپرنٹنڈنٹ ہوسٹل ہمیں فجر کی نماز کے لئے جگانے آیا کرتے تھے۔اس روز جاگنے پر لڑکے جوتوں کو غائب پا کر بہت سٹپٹائے۔اکثر لڑکے اس صبح ننگے پاؤں مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے گئے۔ہر کوئی چوروں کو کوس رہا تھا، جو طالب علموں کے جاتے چرا کر لے گئے تھے۔میں اور رضوان دوسروں سے بڑھ چڑھ کر شور مچا رہے تھے۔جب جامعہ کی گھنٹی بجی، تو کئی لڑکے بدستور جوتوں کے بغیر گھوم پھر رہے تھے۔رضوان نے ایک لڑکے سے پوچھا کہ کیا کسی نے چھت پر بھی نظر ڈالی ہے یا نہیں۔لڑکا چھت پر چڑھا اور اس کا ہنس ہنس کے برا حال ہو گیا۔اس نے لڑکوں کو وہ نظارہ دیکھنے کے لئے چھت پر بلایا، جہاں پر سب کے جوتے قطاروں میں لگے ہوئے تھے۔اس انوکھی شرارت پر رضوان کو خوب داد ملی۔

دراصل اس گاؤں میں، جہاں پر ان دنوں ہمارا جامعہ تقسیم ملک کے بعد عارضی طور پر واقع تھا، کسی قسم کی تفریح کا سامان موجود نہ تھا۔قریب ترین سینما تیس میل کے فاصلے پر ایک دوسرے شہر میں تھا، جب کہ ہمیں فلم دیکھنے کی اجازت نہ تھی۔گاؤں کے باسیوں کے ساتھ طالب علموں کا کوئی رابطہ نہ تھا۔ہمیں ان کے میلوں ٹھیلوں یا قرب و جوار کے فقیروں کے مزاروں پر منائے جانے والے عرسوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ہم لوگ ہاکی، فٹ بال یا والی بال کھیلتے تھے، جو گاؤں کے لوگوں کے لئے بدیسی کھیل تھے۔لے دے کے کبڈی ایک ایسا کھیل تھا۔جس میں جامعہ کے لڑکوں کا مقابلہ گاؤں کے کھلاڑیوں کے ساتھ ہو سکتا تھا۔مگر دیہاتی جن دنوں میں کبڈی کھیلتے تھے، ان دنوں میں

ہمارے سالانہ امتحانات سر پر کھڑے ہوتے تھے، اس لئے ہم ان کی کھیلوں میں شرکت نہ کر سکتے تھے۔ دوسری طرف جامعہ کے پروگراموں اور علمی بحثوں میں دیہاتیوں کو بھلا کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔ اس طرح اس گاؤں میں دو متوازی دنیائیں آباد تھیں، جن کا آپس کا تعلق بے حد محدود تھا۔

یوں تو گاؤں میں بہت سی لڑکیاں پائی جاتی تھیں اور جامعہ کے لڑکے ان کے آگے پیچھے گھومتے پھرتے تھے، مگر وہاں پر ایک لڑکی ایسی بھی تھی، جس پر سارا جامعہ عاشق تھا۔ زلیخا کی جوانی ان دنوں اپنے جوبن پر تھی۔ جس کسی کی نظر اس پر پڑ جاتی تھی، وہ اس کے سحر کا شکار ہو جاتا تھا۔ رضوان بھی اس کے کشتوں میں شامل تھا اور کہا کرتا تھا کہ اس کا بس چلے، تو زلیخا کو لے اڑے۔ مگر ہمیں پتہ تھا کہ سبھی اس کو لے اڑنے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ ہم میں تو اس کے ساتھ بات کرنے کی بھی ہمت نہ تھی۔ جب کبھی ہمارا اس سے آمنا سامنا ہوتا تھا، تو رضوان دل مسوس کر رہ جاتا تھا۔ مگر زلیخا اس قدر بے نیازی سے ہمارے پاس سے گذر جاتی تھی، جیسے ہمارا وجود پایا ہی نہیں جاتا۔ رضوان ایک روز شہر سے سونے کی انگوٹھی بنوا کر لایا اور جب زلیخا اس کے پاس سے گذری، تو اس نے انگوٹھی کو زمین پر گرا دیا۔ پتھر پر سونے کی کھنک سن کر زلیخا نے مڑ کر دیکھا۔ رضوان نے انگوٹھی کو زمین پر سے اٹھا کر اسے پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ انگوٹھی یقیناً اس کی ہوگی۔ زلیخا نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔ رضوان نے کہا کہ اگر اس کی نہ بھی ہو، تو اس کو قبول کر لینے میں کیا حرج ہے۔ زلیخا مسکرا کر جواب دیئے بغیر آگے بڑھ گئی۔ رضوان نے مجھے یہ واقعہ سنایا۔ وہ بے حد خوش تھا کہ اس بہانے زلیخا نے اس سے بات تو کی۔ اسے یقین تھا کہ اب وہ اس میں دلچسپی لے گی۔ چنانچہ اس کی بات درست نکلی۔ زلیخا آتے جاتے ہوئے اس کے سلام کا جواب اپنی بے حد موہنی مسکراہٹ سے دینے لگی۔

ہمیں ہوٹل کی ملازمہ نے بتایا کہ زلیخا کے رشتے کی بات چل رہی ہے۔ بلکہ اس وجہ سے گاؤں میں دوسری لڑکیوں کے رشتے رکے ہوئے ہیں۔ اس نے کہا کہ جب تک زلیخا کی بات پکی نہیں ہو جاتی، اس وقت تک گاؤں کی کوئی لڑکی بیاہی نہیں جا سکتی۔ پھر ہم نے یہ خبر بھی سنی کہ زلیخا کی وجہ سے دو لڑکے ایک دوسرے کے دشمن بن چکے تھے۔ دونوں اس کا رشتہ مانگتے تھے۔ ملازمہ نے کہا کہ اگر زلیخا کا رشتہ ان میں سے کسی کے ساتھ ہوا،

تو دیکھ لینا کہ خون بہے گا۔ میں نے دل میں سوچا کہ وہ ایک آدھ قتل کے تصور سے ڈر رہی ہے۔ جب کہ حقیقت میں بے شمار دل ٹوٹیں گے اور خدا جانے کیا کچھ وقوع میں آ جائے۔

میں گرما کی تعطیلات راولپنڈی میں گذارنے کے بعد واپس لوٹا، تو رضوان ہوسٹل کو چھوڑ کر گاؤں کے ایک مکان میں منتقل ہو چکا تھا، جو زلیخا کے گھر سے ملحق تھا۔ ان دنوں ہر طرف چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ زلیخا کا رشتہ طے پا گیا ہے اور بہت جلد منگنی کی رسم ادا کی جانے والی ہے۔ زلیخا کا منگیتر حکم داد پاس کے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ آدھا گاؤں اس کی ملکیت ہے۔ زلیخا کے ماں باپ نے اس کا رشتہ اپنے گاؤں کے چوہدری افضل کے بیٹے رشید کو نہیں دیا تھا، جس کے سبب فضا میں کشیدگی پائی جاتی تھی۔ منگنی والے روز حکم داد اپنے دوستوں کی ایک پوری فوج لے کر ہمارے گاؤں میں وارد ہوا۔ وہ اپنے ساتھ میراثی اور نٹ لایا تھا، جن کے گانے بجانے نے سارے گاؤں کو رات بھر سونے نہ دیا۔ رشید اور حکم داد کے درمیان گالی گلوچ ہوا، مگر گاؤں کے بڑے بوڑھوں کی ثالثی کے سبب نوبت مار کٹائی تک نہ پہنچی۔ ہوسٹل کی ملازمہ نے کہا کہ اب یہ دشمنی نسل در نسل چلے گی۔

منگنی سے تھوڑے دنوں کے بعد ایک رات کسی نے حکم داد کو اس کے ڈیرے پر سوتے میں کلہاڑی سے مار ڈالا۔ حملہ آور نے ایک ہی وار میں اس کا سر دھڑ سے جدا کر دیا تھا۔ حکم داد کے ملازم نے رشید کو جائے وقوعہ سے بھاگتے ہوئے دیکھا اور کتوں کو اس کے پیچھے لگا دیا۔ رشید چھلانگ لگا کر گھوڑی پر سوار ہو کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا، مگر افراتفری میں اس کا ایک جوتا گر گیا۔ اس جوتے کے علاوہ پولیس کے کھوجی نے رشید کی گھوڑی کے کھروں کا اس کے ڈیرے تک پیچھا کیا۔ بلکہ اس گھوڑی کا سراغ بھی لگا لیا، جس پر سوار ہو کر رشید جائے وقوعہ سے بھاگا تھا۔ ایسے ناقابل تردید ثبوتوں کے ہوتے ہوئے رشید کے لئے اقبال جرم کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس پر مقدمہ چلا اور وہ موت کی سزا پا کر پانسی پر لٹکا دیا گیا۔

حکم داد کے مارے جانے اور رشید کے پھانسی لگ جانے کے بعد کوئی زلیخا کا ہاتھ تھامنے کے لئے تیار نہ تھا۔ سب لوگ اس کو منحوس سمجھتے تھے، جس کا رشتہ مانگنے کی سزا حکم داد اور رشید کو اپنی جان دے کر بھگتنی پڑی تھی۔ ہماری آنکھوں کے سامنے اس کھلے

ہوئے پھول کی پتیاں مرجھانے لگیں ۔ زلیخا اب بہت کم گھر سے باہر نکلتی تھی ۔ اگر کبھی راستے میں نظر آ بھی جاتی تھی ، تو آنکھیں نہ ملاتی تھی ، جس کا صدمہ رضوان کے لئے نا قابل برداشت تھا ۔ اس نے پھر ایک بار زلیخا کو انگوٹھی دینا چاہی ، مگر زلیخا جواب دیئے بغیر گذر گئی ۔ اس طرح دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے چلے گئے ۔ کہاں وہ دن تھے کہ زلیخا صبح و شام دو چار بار اپنا دیدار کرا جاتی تھی اور کہاں یہ حال آ پہنچا تھا کہ ہم دنوں تک اس کی شکل دیکھنے کو ترس جاتے تھے ۔

پھر یہ افواہ ہمارے کانوں تک پہنچی کہ گاؤں کا ایک معمر زمیندار سید قربان علی شاہ زلیخا کے ساتھ متعہ کا نکاح پڑھوانا چاہتا ہے ۔ اس کی دو بیویاں موجود تھیں ، مگر وہ اولاد نرینہ سے محروم تھا ۔ اس نے زلیخا کے باپ کو ، جو اس کا مزارع تھا ، کچھ زرعی زمین دینے اور قرض معاف کرنے کی پیش کش کی ۔ شرط یہ تھی کہ وہ اپنی بیٹی زلیخا کا نکاح اس کے ساتھ کر دے ، جس کی معیاد چھ ماہ ہوگی ۔ اس مدت کے بعد وہ اس کے ساتھ کوئی سروکار نہیں رکھے گا ۔ اگر اس عرصہ میں زلیخا کو حمل ٹھہر جائے ، تو وہ بچے کی پیدائش کے بعد اسے دودھ پلانے کی عمر تک اپنے پاس رکھ سکتی ہے ۔ اس عرصہ میں نان و نفقہ سید قربان علی شاہ ادا کرے گا ۔ اس کے بعد زلیخا بچہ اس کے حوالے کر کے جس کے ساتھ اس کا جی چاہے نکاح پڑھوا سکتی ہے ۔

رضوان نے سن رکھا تھا کہ پنجاب کے دیہات میں لڑکیوں کو اغوا کرنے کی وارداتیں آئے دن ہوتی رہتی ہیں ۔ اس نے مجھ سے اس بارے میں مشورہ مانگا ۔ وہ چاہتا تھا کہ زلیخا کو اغوا کر لے ۔ میں نے پوچھا کہ تم اس کو لے جا کر کہاں پر رکھو گے ۔ تمہارا پاکستان میں کوئی ٹھکانہ نہیں ہے اور ملک سے باہر لیجانے کے لئے زلیخا کو پاسپورٹ چاہیئے ۔ ان دنوں میں پاسپورٹ بنوانا بہت مشکل کام تھا ۔ اس کے لئے بیشتر صورتوں میں رشوت دینی پڑتی تھی ۔ پھر پاسپورٹ بننے میں ایک دو سال لگ جاتے تھے ۔ رضوان زلیخا کی خاطر ہر قسم کی مشکلات برداشت کرنے کے لئے تیار تھا ۔ مگر کون کہہ سکتا تھا کہ زلیخا اس کے ساتھ تعاون کرے گی ۔ آخر اس کو اس کی مرضی کے بغیر تو ملک سے باہر نہیں لے جایا جا سکتا تھا ۔ پھر زلیخا جیسی دیہاتی لڑکی کو اس میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی ۔ رضوان کی اسکیم زلیخا کے علم کے بغیر بنائی گئی تھی اور یہی اس کی سب سے بڑی کمزوری

تھی ۔ رضوان کو خود بھی اس امر کا احساس تھا، مگر اس کا خیال تھا کہ جب زلیخا کو پتہ چلے گا کہ رضوان اس کو گاؤں کے تنگ نظر معاشرے سے آزاد کرانا چاہتا ہے، تو وہ مان جائے گی ۔ میں نے رضوان سے پوچھا کہ اس کے پاس کتنے روپے ہیں ۔ کیونکہ اس کام پر بہت سا خرچ اٹھے گا ۔ پتہ چلا کہ اس کا کل سرمایہ پانچ صد روپے تھا ۔ میں نے کہا کہ اس رقم سے تم بہت دور تک نہ جا پاؤ گے ۔ رضوان نے کہا کہ وہ اپنے باپ کو رقم بھیجنے کے لئے لکھ سکتا ہے ۔ اس پر مجھے بہت ہنسی آئی ۔ میں نے کہا کیا تم اپنے باپ کو لکھو گے کہ تمہیں زلیخا کو اغوا کرنے کے لئے دس ہزار روپے درکار ہیں ۔ ہم جتنا بھی اس بات پر غور کرتے تھے نتیجہ یہی نکلتا تھا کہ معاملہ رضوان کے بس سے باہر ہے ۔

پھر ایک صبح رضوان ناشتے کے وقت میرے کمرے میں آ دھمکا ۔ عام طور سے ہماری ملاقات جامعہ میں ہوتی تھی ۔ میں نے دیکھا کہ شدت جذبات سے اسکا چہرہ تمتما رہا تھا ۔ اس نے کہا کہ اس رات ایک غیر معمولی واقعہ پیش آ گیا تھا، جس کی روداد وہ مجھے فوراً سنانی چاہتا تھا ۔ پتہ چلا کہ آدھی رات کے لگ بھگ اس کے دروازے پر دستک ہوئی ۔ اس نے دروازہ کھولا، تو زلیخا سامنے کھڑی تھی ۔ اس نے کہا کہ وہ انگوٹھی لینے کے لئے آئی ہے ۔ رضوان اسے اندر لے گیا اور انگوٹھی نکال کر پیش کی ۔ زلیخا نے کہا کہ تین روز کے بعد اس کا نکاح سید قربان علی شاہ کے ساتھ ہو رہا ہے، جس نے یہ شرط لگائی ہے کہ لڑکی کو باکرہ ہونا چاہیئے ، وگرنہ وہ اس کو قبول نہیں کرے گا ۔ زلیخا نے کہا کہ وہ اس کی شرط توڑنے کی خاطر آئی ہے ۔ وہ کسی قیمت پر قربانی کا دنبہ نہیں بننا چاہتی ۔ وہ یہ تو نہیں روک سکتی کہ اس کا نکاح سید قربان علی شاہ کے ساتھ پڑھا دیا جائے، مگر وہ یہ ضرور کر سکتی ہے کہ اس کا کنوارا پن اس کی مرضی سے وہ شخص توڑے، جس کو وہ دل و جان سے چاہتی ہے ۔ زلیخا پو پھٹنے تک رضوان کے کمرے میں رہی ۔

اس واقعہ کے تیسرے روز جامعہ کی طرف سے دریا کے کنارے پر پکنک کا پروگرام تھا ، جہاں پر پیراکی اور کشتی رانی کے مقابلے ہونے تھے ۔ میں رضوان کو اپنی سائیکل پر بٹھا کر لے گیا ۔ راستے میں ہماری گفتگو زلیخا کے گرد گھومتی رہی ۔ رضوان اپنے آپ کو کسی زندانی کی طرح سمجھتا تھا، جس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہوں اور وہ کچھ نہ کر سکتا ہو ۔ اس نے بتایا کہ اس نے زلیخا کو اپنے ساتھ بھاگ جانے کے لئے کہا تھا، مگر

وہ نہیں مانی تھی ۔ اس کی نظر میں رضوان کی تجویز نا قابل عمل تھی ۔ رضوان نے کہا کہ اس کو سب سے زیادہ غصہ سید قربان علی شاہ پر تھا، جو ایک لڑکی اور اس کے ماں باپ کی بے بسی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا تھا ۔ میں نے کہا کہ ہم دونوں دنیا میں ہونے والے ظلم وستم کو ختم نہیں کر سکتے اور نہ اکیلے دکیلے افراد معاشرے کو بدل سکتے ہیں ۔ رضوان نے کہا کہ پھر ایسی دنیا میں زندہ رہنے میں کیا دھرا ہے، جس میں ہم چھوٹی سی چھوٹی تبدیلی نہیں لا سکتے ۔ دریا پر پہنچ کر رضوان نے اپنی جیب سے پارکر پین نکال کر مجھے دیا اور کہا وہ اس کی طرف سے میرے لئے تحفہ ہے ۔ مجھے اس بات پر بہت حیرت ہوئی، کیونکہ وہ پین اسکو بہت عزیز تھا اور وہ اسے کسی کو دیکھنے کے لئے بھی نہیں دیتا تھا ۔

رضوان کو میری طرح پیراکی نہیں آتی تھی ۔ میں تو پھر بھی مینڈک کی طرح ہاتھ پاؤں چلا کر تھوڑا بہت تیر سکتا تھا، جبکہ رضوان کو پانی سے ڈر لگتا تھا ۔ وہ ایک منٹ کے لئے بھی دریا میں اترنے کے لئے تیار نہ ہوا ۔ اس نے یہ بہانہ لگایا کہ اس کے پاس جانگیہ نہیں ہے ۔ میں نے کہا کہ میرے بیگ میں ایک فالتو نیکر موجود ہے ۔ جو اس کو مل سکتی ہے ۔ مگر اس نے کپڑے نہ اتارے اور ساحل دریا پر کھڑا پیراکی اور کشتی رانی کے مقابلوں کو دیکھتا رہا ۔ دوپہر کے کھانے کے بعد علمی مقابلوں کا پروگرام تھا، جن میں مجھے حصہ لینا تھا ۔ مجھے فی البدیہہ تقریر میں پہلا انعام ملا ۔ البتہ بیت بازی کے مقابلے میں میری ٹیم ہار گئی ۔ اس روز ظہر اور عصر کی نمازیں جمع کی جانی تھیں ۔ اس لئے آذان تین بجے دی گئی ۔ سب لوگ وضو کر کے نماز کی ادائیگی کے لئے صفوں میں کھڑے ہو چکے تھے کہ دریا کی جانب سے کسی نے پکار کر کہا کہ رضوان دریا میں گر گیا ہے ۔ سب لوگ بھاگ کر دریا کے کنارے پر پہنچے، مگر اس وقت تک رضوان پانی کے اندر غائب ہو چکا تھا ۔ پیراکی کے ماہر طالب علم فوراً دریا میں کود گئے اور پرنسپل نے ایک قریبی گاؤں سے غوطہ خوروں کو بلانے کے لئے ایک سائیکل سوار کو بھیجا ۔ دو غوطہ خور آدھ پون گھنٹے کے اندر جائے وقوعہ پر پہنچ گئے ۔ انہوں نے بتایا کہ جہاں پر رضوان دریا میں گرا تھا، وہاں پر پانی کی گہرائی بیس فٹ کے لگ بھگ تھی ۔ ڈیڑھ دو گھنٹوں کی مسلسل کوششوں کے بعد رضوان کی لاش کو پانی سے نکالا جا سکا ۔ اس وقت تک قریبی قصبہ کے ہسپتال کا میڈیکل آفیسر بھی آ چکا تھا ۔ اس نے معائنہ کرنے کے بعد رضوان کی موت کی تصدیق کر دی ۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ حادثہ کیسے پیش آیا تھا۔ عام طور سے خیال کیا جاتا تھا کہ رضوان وضو کرنے کے دوران پاؤں دھوتے ہوئے پھسل جانے کے سبب پانی میں گر گیا تھا۔ مگر اس صورت میں اس کے پاؤں جوتوں کے بغیر ہونے چاہیئں تھے، جب کہ رضوان کے بوٹوں کے تسمے بندھے ہوئے تھے۔ اکا دکا اس شبہ کا اظہار بھی کیا گیا کہ وہ لڑکا، جس نے رضوان کے پانی میں گرنے پر آلارم دیا تھا، خود رضوان کو دھکا دینے کا مرتکب ہوا تھا۔ مجھ سے کسی نے میری رائے نہ پوچھی۔ اگر کوئی پوچھ بھی لیتا، تو مجھے یقین ہے کہ اول تو میں وہ ساری باتیں نہ بتاتا، جو اوپر بیان ہوئی ہیں اور اگر بیان کر بھی دیتا، تو لوگ میری باتوں پر اعتبار نہ کرتے۔

اس رات ہمارے گاؤں میں پہنچنے تک زلیخا کی رخصتی ہو چکی تھی اور گاؤں پر خاموشی طاری تھی۔ دوسرے روز ملازمہ نے بتایا کہ زلیخا کی رخصتی خاموشی کے ساتھ عمل میں آئی تھی۔ نہ کوئی ڈھول بجا تھا اور نہ کسی نے گیت گائے تھے۔ بالکل یہ لگتا تھا جیسے کوئی لاش رنگ برنگے کپڑوں میں لپٹی لپٹائی ہوئی لیجائی جا رہی تھی۔ اس دن کے بعد میں نے زلیخا کو نہیں دیکھا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ تھوڑا عرصہ بعد ہمارا جامعہ احمد نگر سے ایک دوسرے قصبہ میں منتقل ہو گیا اور ہمارا وہاں پر آنا جانا بند ہو گیا۔

•••••••

مصری سفارت خانہ کا ڈرائیور خود بھی سوڈان کا رہنے والا تھا اور ادیس ابابا میں سوڈانیوں کی کالونی سے خوب واقف تھا۔ اس نے کار کو اندرون شہر کی ایک تنگ گلی میں لے جا کر ایک تین منزلہ بلڈنگ کے سامنے روکا۔ رضوان کے والد اپنے بچوں سمیت استقبال کے لئے گیٹ پر کھڑے تھے۔ رضوان کے بھائیوں میں سے سب سے چھوٹا عین وہی ناک نقشہ رکھتا تھا، جو میرے ذہن میں رضوان کا محفوظ تھا۔ مجھے بیٹھک میں لے جا کر بٹھایا گیا، جس میں ایک طرف ماڈرن فرنیچر لگا ہوا تھا اور دوسری طرف فرشی نشست کا انتظام تھا، جہاں پر شاید قط کی مجلس لگتی ہو گی۔

رضوان کے والد نے کہا کہ وہ مجھے تصویروں سے پہچانتے ہیں۔ وہ الماری میں سے ایک فوٹو البم اٹھا لائے، جس میں رضوان کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ بہت سے گروپ فوٹو تھے، جن میں میں بھی شامل تھا۔ دو تصویریں البتہ ایسی تھیں، جو ہم دونوں کی

تھیں ۔ ایک میں میں نے رضوان کا کوٹ اور اس نے میرا پل اوور پہنا ہوا تھا۔ دوسری تصویر میں ہم نے ایک دوسرے کے کندھوں پر بازو رکھے ہوئے تھے ۔

عبداللہ فیصل کے رضوان کے علاوہ چھ بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں ۔ انہوں نے بتایا کہ سوائے دو چھوٹے بچوں کے ، جو یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے ، باقی کے چاروں بیٹے ان کے ساتھ مارکیٹ میں قط کا کاروبار کرتے تھے ۔ ان میں سے تین کی شادیاں ہو چکی تھیں ۔ اس عرصہ میں ان کے گھر کی ایک عورت ہمیں مشروبات دینے کے لئے آئی ، جس کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ وہ ان کے بیٹے صفوان کی بیوی عائشہ ہے ۔ دراصل وہ پہلے رضوان کی منگیتر تھی ۔ جب وہ پاکستان جاتے ہوئے دو ماہ کے لئے ادلیس ابابا میں ان کے پاس آ کر رہا تھا ، تو انہوں نے اس کی منگنی اپنے دوست ہاشم عثمان کی بیٹی سے کر دی تھی ۔

میں نے کہا کہ رضوان نے کبھی اپنی منگنی کا ذکر نہیں کیا تھا ۔ اس کے والد نے کہا کہ جب اس کی منگنی ہوئی ، تو وہ ابھی بچہ تھا ۔ شاید اس لئے شرم کے مارے کسی کو نہیں بتاتا تھا ۔ اس کی حادثاتی وفات کی اطلاع ملنے کے بعد انہیں اس کا ایک کارڈ ملا ، جو اس نے اپنے مرنے سے صرف ایک روز پہلے لکھا تھا ۔ اس میں اس نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا کہ عائشہ کی شادی اس کے چھوٹے بھائی صفوان کے ساتھ کر دی جائے ۔ اس نے اپنی دستبرداری کی کوئی وجہ نہیں لکھی تھی ۔ اس کے والد کا خیال تھا کہ رضوان ولی اللہ تھا ، جسے اپنی جلد وقوع میں آنے والی وفات کا قبل از وقت علم ہو گیا تھا ۔

(کمر فیلڈ ۔ ۲۴ اگست ۱۹۹۷ء)

جیون خان

میرا طیارہ پیرس کے ہوائی اڈے اورلی پر آدھ گھنٹہ لیٹ اترا تھا۔ اگلی فلائیٹ مجھے تین گھنٹوں کے بعد چارلس ڈیگال ہوائی اڈے سے لینی تھی۔ اس زمانے میں دونوں ہوائی اڈوں کے درمیان شٹل بس چلتی تھی، جو میرے بس اسٹاپ پر پہنچنے سے قبل جا چکی تھی۔ اگلی بس پندرہ منٹوں میں چلنی تھی۔ میں نے ویٹنگ روم میں اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا، تو ایک ہم وطن کو اپنی طرف گھورتے ہوئے دیکھا۔ میں نے اسے سلام کیا اور اس کے پاس جا کر بیٹھا۔ اس نے مجھ سے جاننا چاہا کہ میں کہاں سے ہوں۔ میں نے اپنے شہر ہمبرگ کا نام لیا، مگر اس سے اس کی تسلی نہ ہوئی۔ اس نے پوچھا کہ میں پیچھے کہاں سے ہوں۔ میں نے بتایا کہ میں پاکستان کا رہنے والا ہوں، مگر ایک عمر سے جرمنی میں مقیم ہوں۔ اس نے جاننا چاہا کہ میں پاکستان میں کس جگہ سے ہوں۔ میں نے راولپنڈی کا نام لیا۔ اس پر اس نے میرے گاؤں کا نام پوچھا۔ اب میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا کہ وہ کہیں میرے گاؤں کا رہنے والا تو نہیں۔ مگر مجھے اس کا چہرہ قطعاً نامانوس لگا۔ میں نے کہا کہ میں چنگا بنگیال سے ہوں۔ یہ سن کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے اٹھ کر گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے معانقہ کیا اور کہا کہ وہ مجھے پہلی نظر میں پہچان گیا تھا۔ میں نے اس کا امتحان لینے کی غرض سے کہا کہ پھر تو وہ میرا نام بھی جانتا ہوگا۔ اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ وہ میرے نام سے بالکل ناواقف ہے، کیونکہ ہمارا آپس میں تعارف نہیں ہوا تھا اور کسی نے اس کے سامنے میرا نام نہیں لیا تھا۔

مجھے یاد نہیں پڑتا تھا کہ میں نے اسے اپنی زندگی میں کہیں پر دیکھا تھا۔ مگر میں اس سلسلے میں قابل اعتبار گواہ نہیں ہوں۔ کیونکہ میری چہروں کی یادداشت کمزور ہے۔ مجھے بہت سی باتیں یاد رہ جاتی ہیں مثلاً یہ کہ میں کس سے کب ملا تھا اور ہمارے درمیان کیا بات ہوئی تھی، مگر چہروں کو میں یکسر بھول جاتا ہوں۔ اس نے کہا کہ ہمارا ملنا ۱۹۴۸ء میں گوجر خان میں ہوا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس وقت میری عمر تیرہ چودہ سال کی رہی ہوگی۔ میں نے کہا کہ کیا اتنے برسوں میں میری شکل و شباہت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، جو وہ مجھے پہچاننے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ اس کی یادداشت فوٹو گرافک ہے۔ جس شکل کو وہ ایک بار دیکھ لے، اسے ساری عمر نہیں بھولتا۔ میں نے کہا کہ تم جیسے لوگوں کی پولیس میں بہت مانگ ہے۔ اس نے کہا کہ وہ پولیس کے محکمہ میں ڈی ایس پی ہے۔ اسے نہ صرف میری شکل یاد تھی، بلکہ

وہ ساری باتیں بھی جو میرے اور اس کے باپ کے درمیان ہوئی تھیں۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ اس کا باپ اس قصے میں کہاں سے آ نکلا۔ اس نے کہا بہتر ہے کہ وہ مجھے سارا قصہ شروع سے سنائے۔

وہ اپنے باپ کے ساتھ گوجر خان سے کلر سیداں جانے والی بس میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور بس بھر چکی تھی۔ مگر ڈرائیور چلنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ اس کے باپ کو اس روز گھر پہنچنے کی جلدی تھی، اس لئے اس نے ڈرائیور سے کہا کہ اسے چلنا چاہیئے۔ ڈرائیور نے بتایا کہ وہ ایک شخص کا انتظار کر رہا ہے، جو تھوڑی دیر میں آ جائے گا۔ یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک چھوکرا ہاتھ میں تھیلا پکڑے ہوئے پہنچ گیا۔ وہ چھوکرا میں تھا، جو اسی بس میں صبح کے وقت سودا سلف لانے کے لئے گوجر خان آیا تھا اور اب سامان لے کر واپس چنگا جا رہا تھا۔ ڈرائیور نے اس کے باپ سے کہا کہ اپنے بیٹے کو، جس کی عمر نو یا دس سال تھی، اپنی گود میں بیٹھا لے اور میرے لئے فرنٹ سیٹ پر جگہ بنائے۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ میں چنگا سے ہوں، جہاں پر اس روز کبڈی کا میچ ہونا تھا، جس کو دیکھنے کے لئے لوگ دور دور سے آ رہے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ حمید کے باپ نے کسی قدر بد دلی کیساتھ میرے لئے جگہ بنائی تھی۔ لگتا تھا کہ اسے ایک چھوکرے کیلئے اپنے بیٹے کو گود میں بٹھانا کچھ ایسا پسند نہ آیا تھا۔ مگر بس چلنے کے بعد اسکا رویہ بدل گیا اور اس نے مجھ سے سوالات پوچھنے شروع کر دیئے۔ پہلا سوال یہ تھا کہ میں کس جماعت میں تھا اور کس اسکول میں پڑھتا تھا۔ میں نے بتایا کہ میں قاضیاں کے مڈل اسکول کی آٹھویں جماعت میں پڑھتا ہوں۔ پھر اس نے پوچھا کہ کیا میں انگریزی پڑھ لیتا ہوں۔ وہ کسی انگریزی خوان سے ایک خط پڑھوانا چاہتا تھا، جو اسکو اسکی پنشن کے سلسلہ میں آیا تھا۔ مگر بدقسمتی سے اس روز وہ خط اسکی جیب میں نہ تھا۔ اسکا بیٹا تیسری جماعت میں تھا۔ انکے گاؤں میں پرائمری اسکول تھا۔ گویا چوتھی جماعت پاس کرنے کے بعد اسے کلر کے اسکول میں داخل کرانا پڑے گا اور اسکے بیٹے کو روزانہ تین میل چل کر اسکول جانا ہو گا۔ میں نے کہا کہ میرا اسکول بھی کم و بیش اتنے ہی فاصلے پر ہے۔

پھر کبڈی کے میچ کی بات چل نکلی۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنی جوانی کے زمانے میں کبڈی کا جانا پہچانا کھلاڑی رہ چکا تھا۔ میں نے پوچھا کہ کیا اسے کبھی میرے گرائیں جیون خان کے مقابلے میں کھیلنے کا اتفاق ہوا تھا۔ میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے اس نے جیون اور اسکی بیوی کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ انکا کیا حال ہے؟ کیا وہ چل پھر لیتے ہیں یا بالکل لاچار ہو گئے ہیں؟ اس نے کسی سے سنا تھا کہ جیون گر گیا تھا اور اسکے پاؤں میں موچ آ گئی تھی۔ میں نے بتایا کہ وہ ہمارے مکان کے پچھواڑے میں رہتا ہے اور مجھے اماں اکثر کنویں سے پانی کی بالٹی بھر کر اسکے گھر پر دینے کے لئے بھیجا

کرتی ہیں ۔ جب کبھی میں گوجر خان سے خورد ونوش کی چیزیں لاتا ہوں ،تو اماں اس میں سے ایک حصہ جیون اور اسکی بیوی کو بھیج دیتی ہیں ۔انکی چونکہ اولاد نہیں ، اسلئے ہمسائے میاں بیوی کا خیال رکھتے ہیں ۔ انکی آمدن کا انحصار زمین کی کاشت پر ہے، جوانہوں نے بٹائی پر دے رکھی ہے۔

میں نے سن رکھا تھا کہ جیون اپنی جوانی کے زمانے میں لٹھ مار ہوا کرتا تھا اور میلوں ٹھیلوں پر ہر کسی سے جھگڑا مول لے لیتا تھا۔حمید کے باپ نے کہا کہ یہ محض باتیں ہیں ۔وہ لٹھ مار سے زیادہ کبڈی کا ماہر کھلاڑی تھا اور اپنی جوانی کے زمانے میں ہی بہت بڑا نام پیدا کر چکا تھا۔لوگ پچاس پچاس کوس سے اس کا کھیل دیکھنے کے لئے آتے تھے ۔اس کی ٹکر کا بس ایک سکھ کھلاڑی صوبہ سنگھ تھا۔جس میچ میں یہ دونوں جمع ہو جاتے تھے، وہاں پر تماشائیوں کے ٹھٹھ لگ جاتے تھے ۔دونوں کھیل کے میدان میں ایک دوسرے کے مدمقابل ہوتے تھے،مگر میچ ختم ہونے کے بعد دو قالب و یک جان بن جاتے تھے۔البتہ یہ دوستی بہت دنوں تک نہ چل سکی ، کیونکہ صوبہ سنگھ ڈاکہ ڈالنے لگا تھا۔وہ چاہتا تھا کہ جیون اس کے ساتھ مل جائے ۔مگر جیون نے اس کی بات نہ مانی ، بلکہ اس نے صوبہ سنگھ کو پیغام بھیجا کہ اگر اس نے چنگا یا اس کے قرب وجوار کے کسی گاؤں میں واردات کی ،تو پھر اس کے حق میں جیون سے بڑھ کر برا کوئی شخص نہ ہوگا۔ یہ بات سارے علاقے میں پھیل گئی اور ڈاکو اور بدمعاش جیون سے ڈر کے مارے اس علاقے کا رخ نہ کرتے تھے۔

گوجر خان سے چنگا کا فاصلہ صرف سات میل کا ہے،مگر اس زمانے میں سڑک کچی تھی اور بارشوں کے موسم میں جگہ جگہ سے ٹوٹ جاتی تھی ۔راستے میں پڑنے والی ندی کسی اور بھڈانہ کے نالے کے سبب ، جو دو ٹیلوں کے درمیان بہتا تھا اور جس میں سے گذر کر جانا پڑتا تھا، بس کہیں گھنٹہ بھر میں چنگا پہنچتی تھی ۔ وہاں پر کبڈی کے تماشائیوں کا اچھا خاصا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ میں نے بس سے اترتے ہوئے حمید کے باپ کو رات بھر کیلئے چنگا میں رک جانے اور کبڈی کا میچ دیکھنے کی دعوت دی ۔اس نے جواب دیا کہ اسکا دل تو بہت چاہتا ہے،مگر وہ جیون خان کی وجہ سے ایسا نہیں کرسکتا۔ میں نے ہنس کر کہا کہ جیون خان نے صرف ڈاکوؤں کا چنگا میں آنا بند کیا تھا۔اب تو وہ بیچارہ چلنے پھرنے کے بھی قابل نہیں رہا۔ اسلئے اب اس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے ۔اس نے جواب دیا کہ جیون خان کیساتھ اسکے خاندان کا ایک اور جھگڑا چل رہا ہے، جو ڈاکہ ڈالنے سے بڑھ کر سنگین ہے۔

سہ پہر کو کبڈی کا میچ ہوا، جس کو دیکھنے کے لئے دور ونزدیک کے گاؤں کے چھوٹے بڑے سب آئے ہوئے تھے۔ میں نے اس سے پہلے اتنا بڑا مجمع اپنے گاؤں میں نہیں دیکھا تھا۔جیون بھی لاٹھی

پر ٹیک لگاتا ہوا میدان میں پہنچ گیا اور ایک کٹے ہوئے درخت کی ٹنڈ پر صافہ ڈال کر بیٹھ گیا۔ اسکے جاننے والے اسکے گرد جمع ہو گئے ۔ میں نے اسے یہ شکایت کرتے ہوئے سنا کہ چنگا کی ٹیم میں ایک بھی پرانا تجربہ کار کھلاڑی شامل نہیں ہے۔ کسی نے کہا کہ جوان لوگ ملازمت کے سلسلے میں شہروں میں جا کر آباد ہو گئے ہیں ۔ پیچھے صرف بڈھے اور بچے رہ گئے ہیں ۔ کسی اور نے کہا کہ یہ لوگ اور انکی آل اولاد اب واپس نہیں آئے گی ۔ ہمیں انکو بھول جانا چاہیئے ، ان پر فاتحہ پڑھ دینی چاہیئے ۔ جیون نے کہا کہ وہ پہلی عالگیر جنگ کے دنوں میں فوج میں بھرتی ہو کر دنیا بھر میں گھومتا پھرا تھا، مگر آخر میں اپنے گاؤں میں لوٹ آیا تھا۔ ایک بڈھے نے کہا کہ تمہیں تو واپس آنا ہی تھا، کیونکہ تمہاری بہوٹی یہاں پر بیٹھی ہوئی تھی ۔ جیون نے جواب دیا کہ اس زمانے میں وہ ابھی چھڑا چھانٹ تھا۔ البتہ اسکی چاہنے والیاں بہت تھیں ، وہ چاہتا تو پورا حرم بنا سکتا تھا۔

اس روز خلاف توقع ہمارے گاؤں کی ٹیم جیت گئی ، جس کا سبب ایک نوجوان کھلاڑی منور بنا۔ وہ دوڑنے میں اس قدر تیز تھا کہ مخالف ٹیم اس کو ایک بار بھی نہ پکڑ سکی۔ اگر وہ کبھی گھیرے میں آ جاتا تھا، تو پھرتی سے خرگوش کی طرح دائیں بائیں پچھاڑی مارتا اور صاف بچ کر نکل جاتا تھا۔ دفاع کرنے میں بھی وہ یکتا تھا۔ مخالف کھلاڑی کو پھدک کر اس طرح ٹانگوں کی قینچی مارتا تھا کہ اپنے سے بڑے جوانوں کو بے بس کر کے قابو میں کر لیتا تھا۔ جیون نے کھیل کے خاتمے پر منور کو اپنا جانشین قرار دے دیا اور کہا کہ اب وہ اطمینان کے ساتھ اپنی آنکھیں بند کر سکتا ہے۔

اس میچ کے تھوڑے عرصہ کے بعد اماں نے راولپنڈی واپس جانے کا پروگرام بنا لیا، جہاں پر مجھے اور میرے بھائیوں کو اپنے پرانے اسکولوں بلکہ اپنی سابقہ کلاسوں میں دوبارہ داخلہ مل گیا اور ہماری زندگی اپنی پرانی ڈگر پر چلنے لگی ۔ مجھے گاؤں میں صرف چند ماہ بسر کرنے کا موقعہ ملا تھا، مگر وہ چند ماہ میری زندگی کا ایک یادگار حصہ بن گئے ۔ وہاں پر میری ملاقات جن قابل ذکر لوگوں سے ہوئی ، ان میں جیون خان کا نام سرفہرست ہے۔ البتہ مجھے کبھی اس کے روبرو بیٹھ کر بات کرنے کا اتفاق نہ ہوا۔ میں جو کچھ تھوڑا بہت اس کے بارے میں جانتا ہوں ، وہ مجھ تک دوسرے کی وساطت سے پہنچا ہے۔ اگر اتفاق سے چند برسوں کے بعد میری ملاقات پٹھوہار کے مشہور ڈاکو سجاول کے ساتھ نہ ہو جاتی ، تو مجھ پر جیون کی زندگی کا ایک اہم پہلو شاید ہمیشہ کے لئے پوشیدہ رہتا۔

پاکستان میں اپنی درسی تعلیم کے خاتمہ پر جب میرا جرمنی جانے کا پروگرام بنا، تو میں اپنے عزیزوں سے رخصت لینے کے لئے چنگا بھی گیا۔ وہاں پر میرے قیام کے دوسرے یا تیسرے روز ایک

شخص یہ پیغام لایا کہ سجاول مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ مجھے شام کے وقت تیار رہنے کے لئے کہا گیا، مگر جائے ملاقات کے بارے میں کچھ نہ بتایا گیا۔ عشاء کی آذان ہونے کے بعد، جب کہ خاصا اندھیرا پڑ چکا تھا، سجاول کا آدمی مجھے لینے کے لئے آیا اور گاؤں کی گلیوں میں گھماتا پھراتا ہوا ایک حویلی میں لے گیا، جس کے دیوان خانے میں سجاول اپنا دربار لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اونچے قد کاٹھ کا ایک مضبوط آدمی تھا۔ میرے ساتھ وہ بہت توجہ اور دوستی سے پیش آیا۔ اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا:

" کیا تمہیں پتہ ہے کہ میں نے تمہاری اماں سے پڑھنا لکھنا سیکھا تھا"۔

میں اس بات سے واقف تھا۔ اماں نے ہمیں کئی بار سنایا تھا کہ جب میرے دادا جان نے اپنی حویلی میں بچیوں کو پڑھانے کے لئے مدرسہ کھولا، کیونکہ اس وقت تک لڑکیوں کی تعلیم کا ہمارے گاؤں میں کوئی انتظام نہ تھا، تو سجاول کی ماں اس کو اماں کے پاس لے کر آئی اور کہا کہ میرے بیٹے کو پہلی جماعت میں داخل کر لیں۔

اماں نے کہا:" تم اسکو لڑکوں کے مدرسہ میں کیوں نہیں داخل کراتی ہو؟"

اس نے جواب دیا:"میرا سجاول لڑکیوں کی طرح شرمیلا ہے۔ وہ لڑکوں کیساتھ نہ چل سکے گا"

پھر سجاول نے سنایا کہ ایک دفعہ اس کے ٹولہ کے لوگوں نے ایک مکان میں سیندھ لگانے کا ارادہ کیا، جس کے بارے میں انہیں پتہ چلا تھا کہ وہاں پر عمدہ ترین کراکری، فرنیچر۔ قالین، گھڑیاں اور دوسرا سامان رہائش و آرائش بھرا پڑا ہے اور مالکان مکان خود شہر میں رہتے ہیں۔ سجاول کو ان لوگوں کا نام نہیں بتایا گیا تھا۔ اسے صرف اتنا پتہ تھا کہ وہ مکان چنگا میں پایا جاتا ہے۔ جب وہ لوگ ایک کھیتی میں داخل ہوئے، جس کے ساتھ ہماری حویلی کی بیرونی دیوار لگتی ہے، تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ ہمارے مکان میں سیندھ لگانا چاہتے ہیں۔ اس وقت تک دو تین ڈاکو دیوار کے اوپر چڑھ چکے تھے۔ سجاول نے بتایا کہ اس نے اپنا پستول نکال کر ان کی طرف تان کر کہا کہ فوراً دیوار سے نیچے اتر جاؤ۔ بدبختو میں نے اس گھر میں آنکھوں کی روشنی پائی تھی، اس لئے میں اس گھر پر نہ تو خود ڈاکہ ڈالوں گا اور نہ کسی اور کو ڈاکہ ڈالنے دوں گا۔ یہ بات بہت جلد علاقہ بھر میں پھیل گئی کہ سجاول نے چنگا کو اپنی امان میں لے لیا ہے۔ اس دن کے بعد جب تک سجاول زندہ رہا چنگا میں ڈکیتی کی واردات نہیں ہوئی۔

میں نے سجاول سے کہا کہ کیا اسے پتہ ہے کہ جیون نے بھی اپنی جوانی کے زمانے میں ایسی ہی بات کہی تھی۔ سجاول نے جواب دیا کہ اس کے اور جیون کے درمیان کئی ایک باتیں سانجھی پائی جاتی ہیں۔ البتہ اس کے برعکس جیون نے کبھی ڈاکہ نہیں ڈالا اور کسی کا خون نہیں بہایا، جب کہ وہ یہ بات اپنے

بارے میں نہیں کہہ سکتا۔ جیون کی بیوی کی طرح اس کی بیوی بھی اپنی مرضی سے اپنے ماں باپ کے گھر سے نکل کر اس کے پاس آ گئی تھی۔ دونوں عورتوں کے باپوں کا ردعمل شدید تھا۔

"میری بیوی کے باپ نے تو یہ خباثت کی کہ میری مخبری پولیس کے پاس کر دی اور پولیس کے ایک دستہ نے میرا محاصرہ کر لیا۔ مجھے اپنی جان بچانے کے لئے پولیس کے ساتھ مسلح جنگ لڑنی پڑی، جس میں میرے دو آدمی اور پولیس کے پانچ سپاہی مارے گئے۔ میں نے بعد میں اپنی بیوی کے باپ سے اس مخبری کا بدلہ لے لیا تھا۔ مگر جیون اس معاملہ میں مجھ سے مختلف تھا۔ اس کی بیوی کے باپ نے جیتے جی اپنی لڑکی کو اس کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت نہیں دی اور اس کا داخلہ اپنے گھر پر بند کئے رکھا۔ جانتے ہو کہ جیون نے اپنی بیوی کے ساتھ اس کے باپ کے مرنے اور باقاعدہ نکاح ہو جانے والے روز تک ہمبستری نہیں کی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے نکاح کا اعلان مسجد میں ہو اور وہ باقاعدہ طور پر شادی کی رسومات ادا کر کے میاں بیوی کی زندگی بسر کریں۔ جیون اور اس کی بیوی کے مرنے تک اس کے سسرال نے ان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھا"۔

جب آدھی رات کے لگ بھگ سجاول کا آدمی مجھے گھر چھوڑنے کیلئے میرے ساتھ گیا، تو میں نے راستے میں اس سے پوچھا کہ سجاول نے اپنی بیوی کے باپ سے کس طرح بدلہ لیا تھا۔ اس نے کہا کہ سجاول نے اسکوٹو کے سے ٹکڑے کر کر کے مار ڈالا تھا۔

ہم چارلس ڈیگال ہوائی اڈے پر پہنچے، تو میری پرواز کا اعلان ہو رہا تھا، اسلئے مجھے فی الفور حمید سے رخصت لینی پڑی۔ میں نے چلتے ہوئے اس سے پوچھا کہ کیا وہ مجھے بتا سکتا ہے کہ اسکے باپ نے اس روز چنگا میں اترنے اور کبڈی کا میچ دیکھنے کے سلسلہ میں میری دعوت کو کیوں قبول نہ کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ جیون کی وجہ سے وہاں پر نہیں اتر سکتا۔

حمید نے کہا: "اس کی وجہ یہ تھی کہ جیون کی بیوی میرے باپ کی سب سے بڑی بہن تھی، جس کو میرے دادا نے اپنے خاندان سے خارج کر دیا تھا اور اپنے بچوں کو وصیت کی تھی کہ اس کے ساتھ کوئی تعلق نہ رکھیں"۔

میں حمید سے رخصت ہو کر ائرفرانس کے کونٹر پر چیک ان کے لئے چلا گیا۔ بعد میں جہاز پر چڑھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ مجھے حمید سے اس کی پھوپھی کا نام تو پوچھ لینا چاہیئے تھا، جس سے میں آج تک ناواقف ہوں۔

(ہمبرگ۔ ۱۷ جولائی ۱۹۹۷ء)